A RARE ENGLISH PUBLICATION

KAMALA'S LETTERS

TO

HER HUSBAND

THE whole book is a collection of sixty letters —letters, based purely on domestic affairs and society—letters in which the most ordinary details of family life are described. But the description is so interesting, so pungent, so piercing and inspite of all these so refreshingly beautiful that one cannot leave the book unfinished. But this is not all. The pungency of the style has got its inner allurements too. For there is hardly a single description devoid of the deepest love, which an extremely loving and sentimental wife conceives for a dearly loved husband and under these conceptions, there are hidden a series of growling silence—the outpourings of love-fervour. This has made the book all the more interesting.

The end of the book contains a few love letters. These letters are the masterpiece production of human sentiments. They give us the clear glimpse of the ravages perpetrated by love's terrific storm and the beauty is that every ravage is laden with the deepest pathos which a human mind can scent.

Neatly Printed. Full Cloth Bound with Protecting Cover. Price Rs. 3 only.

The "CHAND" Office, Chandralok—Allahabad

فہرست مضامین

تصاویر

—

چاند

کا پہلا نمبر ہلال نما نکلا، مگر شائق ناظرین نے اُسکو ماہ کامل دیکھکر ایسا ہاتھوں ہاتھ لیا کہ دفتر میں ایک پرچہ بھی باقی نہ بچا اور بہت سے دستِ طلب محروم رہ گئے ۔

اس لئے

دوسرا نمبر پہلے نمبر سے ایک ہزار کی تعداد میں زائد تیار کیا گیا ہے اور پہلے کی نسبت سے نقش ثانی بھی ہے، لیکن مانگ کی کثرت سے غالبًا گمان ہے کہ دوسرا نمبر بھی پہلے کی طرح جلد ہی دفتر میں نایاب ہو جائیگا

ملک و قوم نے "چاند" کو جس ذوق و شوق سے دیکھا اور جو حسن قبول اُسکو رونمائی میں دیا، گو ہم اُسکے شکریہ سے سبکدوش نہیں ہوسکتے، تاہم یہ کوشش بھی ایک قسم کی احسان شناسی ہوگی کہ ہم "چاند" کو تدریجی ترقی سے نہیں بلکہ بڑی تیزی کے ساتھ رشک بدر بناویں ۔

اب علم و ادب کے شایقین کو اختیار ہے کہ وہ عجلت کر کے "چاند" کو حاصل کرنے میں کوشاں ہوں یا دیر کریں ۔ کیونکہ اگر یہ نمبر بھی نایاب ہوگیا تو پھر ایک ماہ کے بعد ہی اسکی زیارت نصیب ہوسکے گی ۔

تام نامی بلا توقف مندرج فہرست خریداران کرالیجئے

پیتن نہ
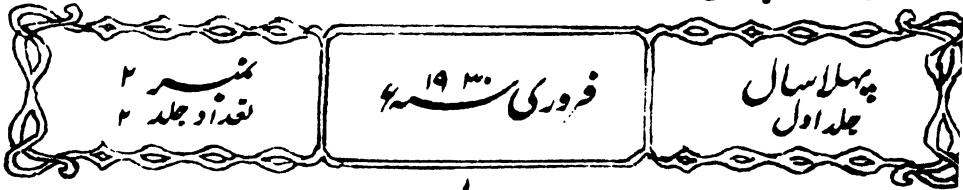
چاند

[جناب منشی سکھدیو پرشاد صاحب سنہا بسمل الہ آبادی]

اے خالق عالم ہیچ ہوں میں ناچیز کی جانب دھیان بھی ہو
نکلے یہ تمنا میری بھی پورا یہ مرا ارمان بھی ہو
کیوں رنج و مصیبت سہ سہ کر برباد رہے دُنیا دل کی
آزاد رہے، آباد رہے، دل شاد رہے دُنیا دل کی
مشہور یہاں وہ ہوجائے مقبول وہاں وہ ہوجائے
جو نظم چھپے جو نثر چھپے مرغوبِ جہاں وہ ہوجائے
تاخیر اشاعت سے اپنی دم بھر کو نہ ہرگز ماند رہے
ہر گوشے میں پھیلے اسکی ضیا دن رات منور "چاند" رہے

چاند

فروری ۱۹۳۰ء

گناہ کی گانٹھیں

عذاب و ثواب دونوں واقعی حالتِ قلبی کا نام ہے جن کی تمیز انسان کو صدا و ندا سے ہو جاتی ہے مثل ہے کہ تانت بولی اور راگ بوجھا اور اگر آپ صداؤں اور نداؤں کو گوشِ ہوش سے سُنیئے گا تو عذاب و ثواب کی مجسم تصویر پیش نظر آجاویگی اور آپ کی طبیعت کسی تشریح و توضیح کی محتاج نہ رہیگی۔

وہ اچھوت ہیں، شودر ہیں، انتج ہیں، چانڈال (قصائی) ہیں، اُن کا دیکھنا گناہ ہے، اُن کا چھوجانا دھرم کو ذبح کرنا ہے! لیکن اسی کے ہمراہ دوسری جانب سے اُس کے برعکس کسی جاندار سے متحرک ہو کر یہ ندا آتی ہے۔ "آؤ ہمارے پارۂ جگر! تمھیں ہم اپنی آنکھوں میں رکھ لیں، ہندو کافر ہیں، بُت پرست ہیں، تمھاری قدر کرنا نہیں جانتے، ہم تم شیر و شکر کی طرح ملکر رہینگے۔" ایک طرف سے ندا آتی ہے۔ "تم شودر ہو، تمھارا چھونا گناہ کبیرہ ہے!" دوسری جانب سے صدائے بازگشت ہوتی ہے۔ "اسلام سب کو بھائی سمجھتا ہے اس کے دائرہ میں بادشاہ و گدا ایک دسترخوان پر کھاتے پیتے ہیں اور نیز ایک ساتھ ہی حج و نماز ادا کرتے ہیں۔" ایک جانب سے آواز آتی ہے۔ "ملتان اور جیکب آباد کی کڑی دھوپ میں تمھارے بچے بھلے ہی پیاس سے تڑپ تڑپ کر مرجائیں لیکن تم ہرگز ہمارے کنوؤں سے پانی نہیں بھر سکتے۔" دوسری جانب سے فوراً آواز آتی ہے "تم کو یہ پریشانی کیوں ہے؟ آؤ پانی کی جگہ ہم تمھیں شربت پلائیں۔

ہندو ہوکر تم پیاس سے تڑپ کر بھلے ہی مر جاؤ لیکن مسلمان ہوتے ہی تمھاری ساری ناپاکی کافور ہو جائیگی اور تم بڑی آزادی سے اُنھیں کنوؤں سے اُسی طرح پانی بھر سکتے ہو جس طرح اعلیٰ ذات کے ہندو بھر سکتے ہیں۔ ایک جانب سے پھٹکار ملتی ہے "چانڈال" "سوچ چ" "دُور رہ" تیرے دیکھنے سے دیوتا کی بے عزتی ہو جائیگی، دوسری جانب سے تعلیم دیجاتی ہے "میرے بھائی، پر بھو عیسیٰ میں اعتقاد کرو! وہ تمھاری آرزوئیں، تمھاری مرادیں پوری کریگا۔ وہ خدا کا اکلوتا بیٹا ہے، اس پر ایمان لانے سے گذشتہ جملہ گناہ سوخت ہو جاتے ہیں"! ایک طرف سے ممانعت ہوتی ہے شودروں کو وید خواہ کتب مذہبی پڑھنے کا حق نہیں۔ دوسری جانب سے اسرار ہوتا ہے "آؤ ہم لوگوں میں شامل ہو جاؤ، ہم تمھیں اور تمھارے بال بچوں کو پڑھا وینگے پڑھاکر اچھے اچھے عہدے دلاوینگے، پھر تمھاری کُل غربت اور تکلیف دور ہو جائیگی"! ایک طرف سے "بے لے" کر کے مخاطب کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ "تیرے اندر آنے سے ناپاکوں کا پاک کرنے والا خدا بشونا تھ کا مندر ناپاک ہو جائیگا" ساتھ ہی دوسری جانب سے "آپ آپ" کہہ کے کہا جاتا ہے "تمھاری ملاقات کی خوشی میں ہم روشنی کرینگے اور ہمارے خانۂ خدا آباد ہونگے!"

دونوں جانب کی باتیں سُنکر اُن بدنصیبوں کی جو ہندو ذات کے جزوِ متروک ہیں، جو ہندو ذات میں معیوب اور قابلِ نفرت سمجھے جاتے ہیں اور جن کی ہستی بدبخت ہندو قوموں کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح چبھتی ہے! وے رام اور گنگا مائی کو پیار کرتے ہوئے بھی اس سے ہمیشہ کے لئے جُدا ہو جاتے ہیں، اس لئے کہ ہندو مذہب کا پیار ان کی ساری تکلیفوں کا باعث ہے اور اُس کا ترک اُن کی جملہ تکالیف کا علاج ہے! بھگوتی گنگا تمام دُنیا کی ناپاکی اور گناہوں کو بھلے ہی ایک قطرہ سے دور دفع کردے، لیکن اُنھیں پاک کرنے سے ہمیشہ مجبور ہے۔ بھگوان بشونا تھ کی انتہائی پرستش، اُن کا نورِ جمال دیکھنا اُن کا بے مثل جلال تمام کائنات کے گناہوں کو بھلے ہی سوخت کر دے لیکن جس روز ایک چمار بادۂ عشقِ حقیقی سے مخمور ہو کر اُن کے مندر میں قدم رکھتا ہے، اُس دن اُن کا سارا جلال گناہ بے عزتی اور بے قدری سے مبدل ہو جاتا ہے!

اس بات کی تائید میں ہند کے قابلِ قدر جناب پرشوتم داس ٹنڈن صاحب کی چند باتیں اُنھیں کے الفاظ میں پیش کرنا ناموزوں نہ ہوگا:-

"میں ہندی زبان کے پھیلانے کے لئے مدراس کے مختلف اضلاع میں گھوم رہا تھا۔ مجھے رامیشورم اور مدورا جانے کا موقع ملا مدراس میں اچھوت ذاتوں کے ساتھ جو برتاؤ ہوتا ہے اُس کا اندازہ تو شمالی ہند کے اونچی سے بھی اُونچی ذات والے نہیں کرسکتے۔ وہاں تو کچھ ایسے مقامات اور گلیاں

ہیں جہاں برہمن رہتے ہیں وہاں شمالی لوگ معمولاً آ بھی نہیں سکتے۔ مندروں وغیرہ کی سیکڑوں گز کی دُوری کے اندر بھی وے نہیں آ سکتے۔ ایک جانب تو ہندو ذات ہی کی ایک جزو کے ساتھ ایسا برتاؤ ہے اور دوسری جانب انگریزوں کی ذلیل خوشامد ہے، جس وقت میں سب ذات کی شیخی بھول جاتی ہے۔ رامیشورم اور مدورا کے مندر تمام ہندوستان میں مشہور ہیں، انھیں دیکھنے کے لئے بڑی دُور دُور سے لوگ آتے ہیں، یورپ اور امریکہ کے بھی مسافر انھیں دیکھنے آتے ہیں، جس وقت میں رامیشورم کے مندر میں تھوڑی دیر کے لئے گھوم رہا تھا، اُسی وقت میں نے دیکھا کہ کچھ انگریز جوتا پہنے ہوئے مندر کے فرش پر گھوم رہے تھے اور بجز اُس خاص مقام کے جہاں کہ محض پوجاری جاتے ہیں دیگر جملہ مقامات میں آزادی سے جوتا پہنے جا سکتے تھے۔

"میں لکڑی کی کھڑاؤں جو معمولی طور پر پہنتا ہوں، پہنے تھا، مجھ سے کھڑاؤں بھی باہر اُتارنے کو ہمارے ساتھ کے پجاری جی نے مندر کی عزت رکھنے کے لئے کہا اور میں نے اسے بڑی خوشی کے ساتھ قبول کیا، لیکن جب میں اندر گیا اور انگریزوں کو جوتا پہنے ہوئے گھومتے دیکھا تو مجھے بہت رنج ہوا، انگریزوں کے ساتھ جو پجاری جی گھوم رہے تھے اُن کے چہرے اور برتاؤ سے ذلت اور غلامی ٹپکتی تھی، دریافت کرنے پر مجھے معلوم ہوا کہ انگریز لوگ برابر جوتا پہنے آتے ہیں۔ مندر کے اندر ہی اُس کے بیرونی حصہ میں جہاں دوکانیں وغیرہ ہیں وہاں مسلمان دوکانداروں کو بھی میں نے دیکھا لیکن ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوا کہ جو ہندو اچھوت سمجھے جاتے ہیں وے چاہے کتنی ہی صفائی سے آنا چاہیں مندر کے آس پاس بہت دُور تک کہیں نہیں آ سکتے، اس قسم کا منظر مجھے مدورا میں بھی دکھائی پڑا۔۔۔۔!

"آج ہماری قوم میں جس قسم کا ہندو دھرم جاری ہے، یہ مذکورہ بالا واقعہ جو روزانہ مندر میں ہوتا رہتا ہے، اُس کی روشن مثال ہے۔ تمام صوبہ مدراس میں تو مذہبی جہالت شمالی صوبجات سے کہیں زیادہ تر نظر آتی ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہاں اچھوت ذاتیں فوراً عیسائی ہوتی چلی جا رہی ہیں، اور وہاں کی اعلیٰ قوموں کے سر پر جوں تک نہیں رینگتی۔ محض ایک ضلع میں مجھے معلوم ہوا کہ گذشتہ پانچ سالوں میں پچاس ہزار اچھوت عیسائی ہوئے ہیں۔"

گڑھوال کے ایک موضع سے دوسرے موضع میں ایک رذیل کی بارات جا رہی تھی، دولھا کسی قسم کی سواری پر تھا، وہاں کی اعلیٰ قوم والوں کے یہ بات برداشت سے باہر ہے کہ ایک رذیل قوم کا لڑکا کسی سواری پر جائے خواہ شادی کر کے جو لڑکی آوے وہ ڈولے میں لائی جائے۔ پھر کیا

تھا؟ کئی گاؤں کے اونچی ذات کے لوگوں نے بارات کو گھیر لیا اور کچھ لوگوں کو مارا پیٹا، آخرکار براتیوں کو سرکاری افسروں کی امداد لینی پڑی بارات کو محاصرہ کرنے والوں میں ہندو اور مسلمان دونوں ہی تھے"۔

مذکورۂ بالا تذکرہ ان بدبخت ہندوؤں کی پُر از افسوس حالت پر جو اچھوت کے نام سے مشہور ہیں پورے طور پر روشنی ڈالتا ہے لیکن تو بھی یہ کافی نہیں ہے۔ یہ تو اُن کے دردناک قصہ کا عشر عشیر بھی نہیں ہے۔ تکلیف، بے عزتی، غیرت مندی اُنکے پیدایشی ورثہ ہیں اور اُن کے دائم ہمراہی ہیں جو دُنیا میں قدم رکھتے ہی اُنکے پاس بلا بلائے آجاتے ہیں اور تب تک ساتھ نہیں چھوڑتے جب تک وے یہ جسم پُر از گناہ سے چھٹکارا نہیں پا لیتے، اس کے یہ معنی نہیں کہ جب تک وے نہیں مرجاتے بلکہ قبل از مرگ ہندو مذہب سے انتقال کافی ہے۔

ہندوستان جو کہ مادرِ دہر ہے اُس کی گود میں آج سات کرور بدبخت اچھوت ذات کہے جانے والی روحیں شبانہ روز بھوکوں مر رہی ہیں فاقہ کشی کی وجہ سے اُن کے پیٹوں میں گڈھے پڑ رہے ہیں۔ آپ دیہاتوں میں جائیے اور جاکر اُن کی ٹوٹی پھوٹی جھونپڑیوں کا معائنہ کیجئے۔ وہاں آپ جس جگر خراش منظر کا معائنہ کرینگے وہ زیر قلم نہیں آسکتا، وہاں ایک، دو، سو اور ہزار ہی نہیں بلکہ لاکھوں اور کروروں کی تعداد میں مائیں بلکہ بلکہ کر رات و دن خون کے آنسو بہا رہی ہیں، آپ خود غرضی کی صدائے فلک دوز سے آسمان کو ہلا دیتے ہیں، آپ کانگرس اور ہندوؤں کے خیر اندیشی کے نام پر لکھو کھا روپیہ کونسلوں کی ممبری کے لئے ہاتھوں ہاتھ تباہ کردیتے ہیں، آپ لیڈری کے نشہ میں زمین و آسمان ایک کر دیتے ہیں، آپ اپنی پیشوا کاری کو قایم و دایم بنانے کے لئے مسلمانوں کے لکھو کھا ستموں پر پردہ ڈالتے ہیں جو ہندوؤں پر ہوئے، آپ اہل اتحادی ہوتے ہوئے بھی کونسل کے نشہ میں مست ہوجاتے ہیں اور کبھی آپ گورنمنٹ کی منصفانہ کارروائی کی بھی ہجو کر دیتے ہیں! لیکن آپ کو اُن زبردستیوں کا پتہ نہیں ہے جو آپ اپنے مذہب والوں پر خود ہی کر رہے ہیں! اور ظلم تو اس بات کا ہے کہ محض اتنا ہی نہیں ہے کہ یہ مذہبی اور تمدنی زبردستیاں مذہب کے پاک نام پر کی جا رہی ہیں! آپ کے پیش نظر آپ کی کروروں مائیں جن کے چہرہ سے محبتِ مادری ٹپکا پڑتا ہے، جن کی صورت ماممتا کی مجسم مورت ہے اور جن کی ہر صدا خانہ قلب مادری کے اندر پاک اور شیریں آواز بازگشت ہے۔ افلاس کی سختی اور آپ کے نادر شاہی احکام کی وجہ سے آپ سے جُدا ہوکر عیسائی اور اسلام کے گوشے آباد کر رہی ہیں! آپ کی آنکھوں کے سامنے لاکھوں شیر خوار بچے بھوک سے تڑپ تڑپ کر جان

دے رہے ہیں! آپ کی شیطانی شہوت کی شعلہ زن آتش میں ہزارہا بکیس بہنیں روزانہ اپنی عصمت جلاکر خاک کردیتی ہیں، آپ گاؤں میں جائیے اور وہاں کے زیادہ تر زمینداروں و نیز اونچی ذات والوں کی اُن زبردستیوں کو دیکھئے جو کہ وے اچھوت ذات پر کہتے ہیں۔

وہاں ہر وقت بدفعلی کا بازار گرم رہتا ہے۔ مکا اور ارہر وغیرہ کے کھیتوں میں اچھوت ذات کی عورتیں زبردستی خواہ مختلف قسم کے لالچ سے اُن شیطانوں کی آتشِ شہوت بجھانے کے لئے بلائی جاتی ہیں! اگر اس واقعہ کو ان بہنوں کے والدین بھائی، برادری اور شوہر وغیرہ دیکھ لیں تو بھی اُنھیں چوں کرنے کا حق نہیں، کیونکہ ایسا کرنے پر اُن کی جان کا خوف ہے! اس طرح پر آج خود ہندو قوم کے ہی ہندوؤں پر جہنمی زبردستیاں ہو رہی ہیں۔ والدین کی آنکھوں کے سامنے لڑکیوں کا، شوہر کی آنکھوں کے سامنے بیویوں کا اور بھائیوں کی آنکھوں کے سامنے بہنوں کا پردۂ عصمت روزروشن میں فاش کیا جارہا ہے، اور اس نمایاں خودسری کو ہماری آنکھیں دیکھتی ہیں اور ہمارے بے حیا کان سُن رہے ہیں، اتنا دیکھتے اور سُنتے ہوئے بھی ہم ہندوؤں کے تیرِ اندیشی کے نعروں کی گونج سے آسمان کو بھرتے ہوئے کونسل کی لالچوں میں مست ہو رہے ہیں! اس سوال کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے۔ اگر وہی اچھوت اپنی بہنوں کی عصمت کی حفاظت اور نیز

اپنے حقوق انسانی کی طلب کے لئے کل عیسائی خواہ مسلمان ہو جاتے ہیں، تب ہم اُن کی عزت کرنے لگتے ہیں، یہ ہندو قوم کا کس قدر خوفناک زوال ہے! ہندو رہتے ہوئے رام اور گنگا مائی کی دہائی دیتے ہوئے آج قریب قریب سات کروڑ مذہب کے سچے لال اپنی بہنوں کی عصمت کی حفاظت نہیں کرسکتے اور نیز انسان نہیں کہے جا سکتے! لیکن جب وے عیسائی خواہ مسلمان ہو جاتے ہیں، تب اُنھیں آزادی مطلق مل جاتی ہے اور بڑی بڑی موچھوں اور لمبے لمبے ترپنڈا کار چندن لگانے والے و نیز جٹا جوٹ رکھنے والے مہنت لوگ اُنکی عزت کرنے لگتے ہیں! یہ مبالغہ نہیں ہے! اس مکروہ منظر کا ثبوت آج کے کروروں مسلمان اور لاکھوں عیسائی ہیں، زبردستی و تظلم کا قصہ ابھی ختم نہیں ہوا، یہ بے انتہا ہے، بے شمار ہے، یہ خراشِ غم و الم سے نہایت تیز تر ہے، آہ سے زیادہ سوزاں اور زبردستی سے زیادہ تکلیف دہ ہے! یہ رات ودن کی فاقہ کشی کی کہانی ہے، یہ اُن ماؤں کی کہانی ہے جو اپنے جان سے عزیز بچوں کی نعش اپنی ٹوٹی جھونپڑی میں چھوڑکر شیطان بشکل انسان زمینداروں اور تعلقداروں کی بیگار کرنے جاتی ہیں، یہ اُن بیویوں کی کہانی ہے جو اپنے سرمایہ حیات، اپنے شوہر کے و نیز اپنے مایہ حیات کو بسترِ مرگ پر چھوڑکر زبردستی کی برہنہ تلوار کے سامنے اپنی گردن جھکا کے بیگار کرنے جاتی ہیں، یہ اُن بہنوں کی کہانی ہے جو اپنے ماں باپ

اور بھائیوں کے سامنے رات و دن شورہ پشتوں کی
شہوت نفسانی کا شکار ہوتی ہیں، یہ اُن بدنصیب
بچوں کی کہانی ہے جو اپنی ماؤں کی گود میں اُن کے
دودھ سے سوکھے سینوں کو منہ میں ڈالے بھوکوں تڑپ کر
جان دیتے ہیں، یہ اُن مردوں کی کہانی ہے جو
اپنی آنکھوں سے اپنی عورتوں کی عصمت خراب
ہوتے دیکھتے ہیں اور اپنے مریض بیویوں اور بچوں
کو شکستہ دیواروں کے درمیان میں اور ٹوٹی پھوٹی
چھتوں کے تلے طوفان اور بارش کی مرضی پر
چھوڑ کر اپنے سنگدل مالکوں کے کھیتوں میں ہل
چلانے جاتے ہیں، یہ عصمت کے برباد کی جانے کی
کہانی ہے، یہ بے حد افلاس کی جگر خراش کہانی ہے،
یہ انسانیت کے انتہائی زوال کی دل دوز کہانی
ہے، یہ ہندو مذہب اور نیز ہندو قوم کی بربادی
کی پُرغم کہانی ہے، اور ساتھ ہی ہندوستان میں
یہ عیسائی و نیز مذہب اسلام کے ظہور کی بھی کہانی
ہے، یہ خاموش اُمید و فاقہ کشی، پوشیدہ رونے
و نیز چپ چاپ تکالیف کی دلسوز کہانی ہے،
جہاں زندگی کے ہر ایک لمحہ میں نا اُمیدی کی مسلسل
لہریں اُٹھتی ہیں اور اُٹھ اُٹھ کر دل کی جملہ خواہشات
کو اپنے اندر غرق کر لیتے ہیں، اس لئے یہ کہانی
لاانتہا ہے، بعید از بیان ہے اور بیحد ہے۔

اُونچی ذات کے ہندوؤں کی شیطنت و نیز
اچھوت کہی جانے والی ذاتوں پر ہمیشہ ہونیوالے
بے خوف و خطر زبردستیوں کی یہ کہانیاں بڑے
بھاری ہندو قوم کی ہستی کے بڑے قلعہ کے چاروں
طرف بکھیر دی گئی ہیں۔

یہ ہندو مذہب کے خوشنما باغیچہ میں بکھری
ہوئی گناہ کی جڑیں ہیں! ان کانٹوں کے ہر
چہار طرف ذاتی حیثیت کے خیال اور خاندانی بزرگی
کی بے بنیاد دلیلیں اور بک بک و ہرزہ گوئی
ہے! اس آواز بازگشت کے ہر ایک جز میں مذہبی
زندگی کے غمگین ترانے اور آتشیں راگنیاں گائی
جا رہی ہیں، اُن راگنیوں کے صور اسرافیل کو
سُنکر قومی تواریخ کے مُردے اپنی شعلہ زن اور
خشمگین آنکھوں سے جذبات و تخیلات قلبی کو سوخت
کر کے اُن کے شعلوں کی روشنی میں رقصاں ہیں، ان
جذبات و تخیلات کے اندر جملہ سامانِ قیامت یکجا
ہے اس لئے ہندو قوم۔ ہندو قوم کی معراج عصمت
ہندوستانی شائستگی، ہندوستانی تواریخ، ہندو مذہب
و نیز خود ہندوستان، آج پریشان و منتشر ہو رہے
ہیں۔ جس بدقسمت قوم کی عزت رکھنے کے لئے
بپاراول نے خون کی ندیاں بہائی تھیں، جس معظم
ہندو قوم کی لازوال عصمت کو اخیر وقت تک قایم
رکھنے کے لئے ہزاروں راجپوت جوانوں نے جوہر شمشیر
کی لپکتی ہوئی آگ کے شعلوں میں اپنی بے بہا زندگی
کو ہنستے ہنستے سوخت کر دیا تھا، جس ہندو شائستگی کو
ضایع ہونے سے بچانے کے لئے ہندو قوم کے باعثِ فخر
مہاپرتاپ، شیواجی نے سلطان مغلیہ کے جلا کر خاک
کر دینے والے قہر پر ہندوستانی سلطنت کی بنیاد ڈالی

تھی، ہندو قوم کی جس اعزاز پر دھبہ نہ لگنے دینے کا تحفظ کرنے کے لئے ایک دو تین نہیں بلکہ نہ معلوم کتنے بار یکشت بہادر، مذہب اور ملک پر مرمٹنے والے راجپوتوں نے پیلا جامہ پہنکر چتور کے عظیم قلعہ کے باہر نکلکر "یک لنگ" کے فتح کے ناقوس کی صدا سے تمام ہندو ذات کے جھنڈے کو گرنے سے بچایا تھا، وہی مذہب، وہی معراج، وہی اعزاز آج خود ہندوؤں کے ذریعہ سے پامال کیاجارہا ہے! آج خود ہندو ہی مذہب کے متبرک نام پر مذہب کا خون کر رہے ہیں، آج ہندوستانی عورتوں کی عصمت زیادہ تر ہندوؤں ہی کے ذریعہ سے برباد کی جارہی ہے، اس لئے تمام ہندو قوم کو قیامت کی خوفناک سزا سے بچانے کے لئے ضرورت ہے کہ ہم اپنے گذشتہ گناہوں کا کفارہ کرکے "اچھوت" کہے جانے والے بھائیوں کی عزت اور وقعت کریں۔ اُنھیں اپنے میں بلائیں اور ایسا کرکے ہندو قوم کی کمزور بنیاد کو مضبوط بناویں ورنہ بربادی کے قیامت نما زلزلہ میں ہماری زندگی کی جملہ شاندار راگیں منہدم ہو جائیں گی اور اس خوفناک عمارت میں ذاتی شرف کی آرش نظموں کے ترانے طوفان فنا میں کمزور و ضعیف ہوجائیں گے۔

ہندو قوم کا ہولناک زوال

[اچھوت لوگوں کی خدمت کی بنیادی اصلاح]

برابری کا برتاؤ قومی خدمت کی بنیادی اصلاح ہے، چاہے آپ کا مقصد کتنا ہی اونچا کیوں نہ ہو چاہے آپ میں قوت ترک بدرجۂ غایت کیوں نہ پہنچ گئی ہو، چاہے خدمتگذاری کے فرض پورا کرنے میں آپنے جملہ باتوں کو الوداع کیوں نہ کہدیا ہو، لیکن جب تک آپ کے دل میں برابری کے برتاؤ کے اصول پر اعتقاد پیدا نہیں ہوتا، جبتک آپ ملک کے سب لڑکوں کو برابری کی نگاہ سے دیکھنے کی قابلیت نہیں حاصل کرلیتے، جبتک آپ کے دل میں ترک کے ساتھ عجز کا خیال بھی ظہور پذیر نہیں ہونے لگتا اُس وقت تک آپ کی خدمتگذاری کا، آپ کی تدبیر ترک کا ویسا دلخواہ، خوبصورت شیریں پھل نہیں ہوسکتا، کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جب تک آپ کے اندر مغائرت کا غلبہ ہے جب تک اپنی خدمتگذاری اور اپنی تدابیر کی وجہ سے آپ اپنے کو اپنے کسی بدنصیب بھائی سے اونچا مانتے ہیں، جب تک آپ اپنے پُر از ترک خیالات کے دام میں دانستہ خواہ نادانستہ پابہ زنجیر ہو رہے ہیں۔ کسی طرح پر بھی اُسے دل میں جگہ دیتے ہیں جبتک آپ اپنے خادم ہونے کے باعث اپنے آپ کو خدمتگذاری کی وجہ سے زیادہ بزرگ خواہ زیادہ تر اہم مانتے ہیں تب تک آپ کے سراپا خیر ریاض کا نتیجہ اتنا متبرک، اتنا پاک اور تیز اُتنا قابل تعظیم نہیں ہوسکتا جتنا کہ ہونا چاہئے، اس لئے ہمارا یہ خیال ہے اور ہم اسے بار بار کہیں گے کہ قومی خدمت گذاری کو

ہمیں اپنی روزانہ زندگی کا ایک جزو ضروری ویسا ہی ماننا چاہئے، جیسا ہم اپنے بھائی کی پرورش کو، بیوی کی حفاظت کو، باپ کی محبت کو، بیٹے کی تعلیم کو مانتے ہیں، اچھوت کی رستگاری کی بابت کسی قسم کی کی تدبیر پر غور کرنے کے وقت ہمیں اس بنیادی اصول کو سب سے پہلے اپنے پیش نظر رکھنا چاہئے۔

ہندوستان کے صاحب کمال لیڈر مہاتما گاندھی نے ایک موقع پر کہا تھا کہ اچھوت کی رستگاری ہم کیا کرینگے؟ ہمیں تو سب سے پہلے اپنی گلو خلاصی، کرنا چاہئے کیونکہ ہماری رہائی ہوتے ہی اچھوتوں کی رستگاری از خود ہو جائیگی"۔

جناب والا کا یہ بزرگ کلام سچ پوچھئے تو اسی اصول کا اظہار ہے۔ جس کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں یہی سبب ہے کہ آج تیس چالیس سالوں سے ہم اچھوتوں کے بہبل کو لیکر سخت شور و غل مچانے میں محو ہو رہے ہیں لیکن ہمیں پوری کامیابی نہیں حاصل ہوتی ہے۔ بات تو یہ ہے کہ ہم نے اس شور و غل میں بھی اس بات کو ہرگز نہیں بھلا دیا کہ اچھوت سے ہم اونچے ہیں، ہم علمی قوت، مالی قوت جسمانی قوت والے ہیں اچھوت، کمزور، پامال، بے زر اور جاہل ہیں ہم دوسروں کا بھلا کرنے والے ہیں اور اچھوت بھلا کرانے والے ہیں، ہم رحم کر کے، مہربانی کر کے اُن کی رستگاری کے لئے پیشوا ہوئے ہیں، وے اپنی رستگاری کے لئے، اپنی اصلاح کے لئے، اپنی روشن ضمیری کے لئے، اپنی گم گشتہ جائداد کے پھر پانے کے لئے ہمارے سامنے کھڑے ہو کر ہماری جانب آرزومند نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں، اسی خیال نے، خودی کی ایسی سیاہ کاری نے اپنے برتری کی اسی شیطانی خو نے ہمارے کامیابی کے راستہ کو پرخار کر دیا ہے۔ سچ پوچھئے تو ہم، ہم جو عالی خاندان میں پیدا ہونے کا فخر کرتے ہیں، ہم جو مرکز عقل، طاقت کے خزانہ، زر کے بحر ہونے کی کتب مذہبی کی سند یافتہ ہیں قوم کے چھوٹے محل میں گھومتے پھرتے ہیں، ہم جو شودر کے رہنما، اچھوت کے اکیلے خیر اندیش، انکے ماں باپ بن کر بڑے کروفر کے ساتھ پبلک پلیٹ فارموں پر لمبی چوڑی گھنٹوں تقریریں کرتے ہیں، ہم جو اچھوت کی رستگاری کی اعلیٰ صلاح مدبر ہونے کا دعویٰ رکھکر بھی بھنگی کی لڑکی، چمار کی لڑکی، چانڈال کی لڑکی اور نیز چوڑا کی لڑکی کو اپنا بدن چھلانے کے لئے ایک نہیں ہزار بار اظہار نفرت کرتے ہیں، اچھوتوں کو ذلت دینے والے ہیں آج کتنے ایسے بزرگوار ہیں، مہاتما گاندھی کی طرح چانڈال کی بیٹی کو اپنی "لکشمی" بنا کر ہمیشہ اُسکے لڑکپن کے برندا بن میں کرشن کی بازی طفلانہ کرتے ہیں؟ آج پلیٹ فارموں پر بھاری آواز میں چیپوں چیپوں کرنے والے کتنے ہی ایسے فریب کے جامہ پوش بڑے بڑے روشن ضمیروں کو ہم جانتے ہیں کہ جو انکے دیکھنے میں اپنا لخت جگر کہکر اچھوت کو یک جان دو قالب

مان کر و نیز شودر کو اپنا برادر مادر زاد قبول کر کے
بھی پسِ پردہ اُس کے چھو جانے سے نجاست،
دیدار سے بدشگونی اور نیز انکے تعلق میں زیاں
مان کر اس سے دور رہنے کی خواہش کرتے ہیں۔

ایسے لوگ تو ہماری نظروں میں اُن سے بھی
زیادہ گناہگار اور نیز شیطان ہیں، جو اپنی جہالت
کے جوش میں دھرم (خواہ ادھرم) کے جنون میں
اور نیز پُرانے مسلسل تعلقات کی روانی میں اچھوتوں
سے نفرت کرتے ہیں۔ لیکن متذکرہ روشن ضمیروں
کی بات ہم نے موقع پڑ جانے پر کہی ہے، واقعی
میں ہمارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہماری بدنصیبی
سے، ہمارے متعدد اصلاح کنان میں ایسے لوگوں
کی تعداد کا یکبارگی غلبہ ہے جو محض محبت خالص
کے باعث نہیں، محض خالص ترک کے جوش میں
آکر نہیں، محض خدمتگذاری کی پاک تحریک سے متحرک
ہوکر نہیں بلکہ اپنے زور علم اور نیز ثروت کو شودروں
و نیز اچھوتوں کی خدمت میں لگا کر اپنے قلب کے
خیال خودی کو استعمال کرنے کے لئے اپنی رحم دلی
کے بھاؤ میں اچھوتوں کو غوطہ لگواکے اپنی بزرگی کو
ثابت کرنے کے لئے اپنی فکر اصلاح کو واہ واہ سے
شاد باش کرنے کے لئے اور نیز اپنے ریاض ترک کے
گوشہ کو نامزد کرنے والے عوام کے جے جے کی صدا
سے کانوں کو خوش کرنے کے لئے اچھوتوں کی خدمتگذاری
کے تیرتھ گاہ میں قدم رکھتے ہیں، سچ پوچھو تو اچھوتوں
کے مسئلہ کے اور بھی لاحل بنجانیکا بھی اصلی سبب ہے۔

ہم نے اوپر جس قسم کے اصلاح کاروں کا تذکرہ
کیا ہے، اُن میں بہت سے ایسے ہیں جو بے جانے
بوجھے لالچ کی لہر میں پڑ کر بہہ جاتے ہیں اور
بہت سے ایسے ہیں جو جان بوجھکر لیکن نہ جاننے
کا سا رُخ بناکر اسی لالچ کے خنجر تلے اپنی جان
دیدیتے ہیں تو بھی اُن کی فکر و کوشش میں
راستی کا جُزو ہے، اُن کے ریاض میں ترک کا جلال
ہے لیکن کیا ہی اچھا ہو اگر ہمارے اصلاح کنان
اچھی طرح ذہن نشین کرلیں کہ اچھوتوں کا سوال
ہمارا ہی سوال ہے، ہم نے خواہ متقدمین نے
ان کے ساتھ جو بے انصافی اور زبردستی کی ہے
اُس کا کفارہ کئے بغیر ہمارے ملک کا، ہماری قوم کا
ہماری ذات کی کسی طرح نجات نہیں ہے، شودر
ہمارے رحم کرنے کی شے نہیں ہیں بلکہ ان کے
متعلق ہمارا جو واجب اور مذہبی نقطہ سے درگزر
نہ کیا جانے والا فرض ہے اُس کا کرنا ہماری
ترقی ذات و ملک کے ظہور کے لئے ازحد ضروری
ہے، کہنے کا مطلب یہ ہے کہ غرور کے خیال اور
صورت سے مست ہوکر نہیں، اُونچ نیچ کے تفرقہ سے
گمراہ ہوکر نہیں، خودی کے سخت اثر سے متاثر ہوکر
نہیں بلکہ سیدھی محبت کے خالص رُو سے اور پاک
کفارہ کے خیال میں اپنے دل کو رنگ کر اور نیز
اُس کو غوطہ دیکر اگر ہمارے ملک کے نوجوانان اور
نوعمر عورتیں اس مسئلہ کو حل کرنے میں مستعد ہوں
تو یہ یقین ہے کہ خود خدا کا رحم اُن کے اس پُر از غار

راہ کو صاف کر دیگا اور تسکین قلب کی روشنی کے اُجالے
میں وہ اپنے متبرک نشانہ کا رُخ روشن دیکھکر سُرور
بے غش سے مسرور ہو اُٹھینگے۔

اچھوت اور اپنا اعزاز

ہم نے اصلاح کاروں کی جس قوت کے عیب و ہنر
پر غور کیا ہے اُس سے اچھوتوں کی فلاح میں ایک
سب سے بڑا نقص سرزد ہوا ہے، وہ یہ ہے کہ اچھوتوں
کی ترقی کی ہر ایک قوت میں اس بات کے پیش نظر
رہنے کے باعث اچھوتوں کو اپنے ذاتی اعزاز کے
شگوفہ کو پھولنے پھلنے کا ویسا موقع و محل نہیں ملا۔
صدیوں کی بے انصافیوں، زبردستیوں اور نیز
ناواجب برتاؤں نے ان بدبخت رذیلوں اور انتجوں کو
کمزور اور نیز خراب ہی نہیں کر دیا بلکہ اُن کے
جگر سرا میں آزادی سے کھُل کھیلنے کی جملہ قوتوں
کو بھی سوختت کر ڈالا ہے، اُن پر محض زبردستیاں
ہی نہیں ہوئیں بلکہ اُن کے ساتھ برتاؤ ناواجب
بھی از حد ہوا ہے اور اُن کی جملہ قلبی، دماغی،
روحانی قوتیں اور سمجھ بوجھ، غور و فکر وغیرہ کی
رگیں جور و ستم کے سنگ آسیا میں پیس ڈالی
گئی ہیں، آج سے نہیں، بدھ کے زمانہ سے
ہی اور ممکن ہے اُس کے بھی پہلے سے شودروں
(رزیلوں) کا زیر حکومت اور ہیچکارہ رکھنا
شروع ہوگیا تھا تب مُجگوں کی نہیں کلبوں کے
عرصۂ دراز سے ہیچکارہ رہکر شودروں (رزیلوں)
میں اخلاقی شرف کا سلسلہ باقی رہ سکتا تھا اور
اگر کبھی کبھی اُس آتش سوزاں میں سے ایک آدھ
چنگاری چمک اُٹھتی تھی، اگر کبھی بھی اس
قید خانہ آہنی کی دیواریں توڑکر ان کی پریشان
شرف اخلاق کی شعاع باہر نکل آتی تھی اگر
متروک بھائیوں کا سمع خراش نعرہ ہمارے
سوختہ محل جماعت کے ویرانہ کو لمحہ بھر کے لئے
آباد بھی کر دیتا تھا تو اس کا بھی خاتمہ
ہمارے مخالفت کے پائیدار پیشوا کاروں اور
اُن کے پیرؤں کے ہاتھ ہو جاتا تھا، بھارت ماتا
کی شیریں زبان نے دارالسلطنت دہلی میں تمام
ہندوستان کی متحدہ جماعت کے روبرو بڑی بلندی
سے بڑے زور و شور سے کہا تھا:۔

"غربا پروری کی نگاہ سے محتاجوں کی دستگیری
کرنا ان کی ٹھیک بے عزتی کرنا ہے، یہ بے عزتی
موت سے زیادہ تر خوفناک ہے، کیونکہ جس طرح
پر دولت دولتمندوں کی، خوبصورتی حسینوں
کی اور قوت تخیل شعرا کی ثروت ہے اسی
طرح غرباء کی دولت ہے 'اپنی عزت'۔

کیسے شستہ کلام ہیں اور ان کلاموں میں
خدمت گزاری قوم کی کیسی صاف تشریح ہے۔
ہماری رائے میں ہر شخص کو جس نے خدمت گزاری
قوم کے لئے قدم اُٹھانے کا فیصلہ کر لیا ہے خواہ
پہلے ہی سے اس میدان میں آکر حصول ثواب
کر رہے ہیں ان شستہ الفاظ کو اپنے لوح دل

پر اعتقاد کے حرف زر سے لکھ لینا چاہئے۔

اس لئے ہمارا کہنا ہے کہ جب تک آپ اچھوت خواہ انتج کہلانے والی قوموں کو اُنکی اعزاز ذاتی کا اُن کے دل عزت کا احساس نہیں کراوینگے تب تک اُن کی ترقی کی، اُنکے بہبودی کی، اُن کی بیداری کی، اُن کے اُبھاڑ کی جملہ تدابیر بالکل بیکار اور بے نتیجہ ثابت ہونگی اُن کا معراج، اُن کا فرض، اُن کا دھرم، انکی انسانیت حتی کہ اُن کی کل کائنات اس طرح پر پردۂ سیاہ ظلمات میں پوشیدہ رہیں گے لیکن اُن میں اپنی ذات کے شرف کا خیال بیدار کرنے کے لئے آپ کو اپنے غرور کی قربانی کرنی ہوگی، اپنی خودی کا خیرباد کہنا پڑیگا، اپنے بزرگی کے خیال کو الوداع کرنا پڑیگا، اپنے ترک، ریاض اور نیز خدمت کے اندر موجزن مغائرت کی تمیز کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہنا پڑیگا، جب تک آپ اُنھیں کے ہوکر اُن کے پاس نہیں جائینگے، جب تک آپ اُن کے دل میں یہ لا واثق یقین نہیں قایم کر دینگے کہ ہندو ماتا اور ہندو قوم کی اولاد کے رشتہ سے وے اور آپ دونوں ایک ہیں، بھائی ہیں، آپ میں اور اُن میں سرِمُو مغائرت نہیں ہے، تب تک آپ اُن کے خانۂ دل سے خارج شدہ ذاتی اعزاز کو دوبارہ داخل کرنے میں کامیاب نہ ہونگے، خیرات کی شکل میں نہیں بلکہ محبت کی شکل میں آپ اُنھیں اپنی خدمت گُزاری کا تحفہ دیجئے، غرور کے خیال کے ساتھ نہیں بلکہ عجز کی تحریک سے متحرک ہوکر آپ اُنھیں اپنے کلیجہ سے لگائیے، مغائرت کے خیال کا خاتمہ کرکے خالص برابری کی صورت میں آپ اُنکے ہاتھ میں ہاتھ دیکر جماعت کے مجلسوں میں قدم رکھئے، تب آپ کی تدبیر بارآور ہوگی، تب آپ کا ترک راست ہوگا، آپ کا ریاض مکمل ہوگا، تب آپ تسکین دل حاصل کرکے خالق دارین کے جمال کی مکمل صورت اپنے آئینۂ دل میں دیکھنے کے قابل ہونگے، قبل اس کے نہیں، کسی طرح پر نہیں!

ایک روز یکشنبہ کی تعطیل کی صبح کو اپنے ساتھ اچھوتوں کو لیجاکر شہر کے دوچار کوؤں پر چڑھا دینے سے و نیز اپنے اس لاثانی، لاجواب، بے مثل ہمت و نیز عمل کے قصہ کو اخباروں میں شایع کرا دینے سے ہی کام نہیں چلے گا، کسی خاص انتج کو دوچار وید منتروں کے ذریعہ سے پاک کرکے ان کی سیاہ پیشانی پر زرد رنگ کے صندل کا ٹیکا لگا کرکے و نیز سالانہ جلسہ کے مجمع میں شیر کی صورت میں اس متبرک، قابلِ ثنا کام کے لئے واہ واہ کی داد حاصل کرکے بعدہٗ اُسے اُسکی قسمت کے حوالہ کر دینے میں بھی اچھوت لوگوں کی رُستگاری کے خواب کی واقعی تعبیر نہیں ہوگی، اسی طرح پر ایام ہولی میں مختلف قسم کے رنگوں میں رنگے ہوئے جامہ کے ساتھ لاجواب

مردانگی سے چانڈال سے ہیل میل کرا کے سال بھر کے لئے اُسے پھر چھونے کے قابل بنا دینے سے انچ کے گناہوں کا کفارہ نہ ہوگا، ان نمائیشی باتوں سے اس پیچیدہ سوال کا فیصلہ نہیں ہوگا، اِن بے سود نمائیشوں سے اس اہم مسئلہ کا فیصلہ نہیں ہوگا، یہ بات آپ کو اپنے دل میں اچھی طرح نقش کرلینا چاہئے خیالی پلاؤ میں شیرینی نہیں ہوتی، محض خیالی پانی سے تشنگی رفع ہونا ناممکن ہے، یہ کلام پسندیدہ تو نہیں ہے لیکن بالکل راست ہے۔

یہی باعث ہے کہ گاندھی جی اچھوتوں کو خیرات نہیں بلکہ کام دینے کے جانبدار ہیں، بے غرض خیرات کرنے والے اور بے غرض خیرات قبول کرنے والے کی بات ہی دیگر ہے، لیکن معمولاً جو خیرات ہماری آنکھوں کے سامنے روزانہ دکھائی دیتی ہے وہ خیرات پانیوالے کے خیالات کو ذلیل بنا دیتا ہے، خیرات کنندہ کے ارادہ خیرات کے ہی ساتھ اپنے خیال شرف کا شگوفہ لگا رہتا ہے اور سائل کے خانۂ دل میں ذاتی اعزاز کے مشعل کی روشنی خیرات لینے کے ساتھ ہی کم ہو جاتی ہے ونیز بہ زمانہ آئندہ جہاں عادت پڑ جانے پر مغرور خیرات غرور کی مجسم شکل بن جاتا ہے اور سایل اپنے ذاتی اعزاز کی روشنی ضایع کرکے ایک خوفناک تاریک غار میں گر جاتا ہے۔ اسی لئے اس وقت ایسے اصلاح کنندگان کی ضرورت ہے جو اچھوتوں کے دل میں دوبارہ واجب اعزاز ذاتی کی تیز روشنی روشن کردیں جس سے اچھوت

اپنے شرف کو پہچان لیں اور کھانا اور خیرات لینے کے مقابلہ میں وے بھوک کی آگ میں زندگی ختم کردیں حیا کی حفاظت کے لئے کپڑوں کا سوال کرنے کے مقابلہ میں وے سمندر کے پانی میں ستر پوشی کرکے اپنی حیا کو ڈھک دیں یا اپنے پسینے سے پیدا کردہ معاش سے اپنی اور نیز اپنے گھر والوں کی پرورش پرداخت کریں، ان کے دل میں یہ خیال بالکل مستحکم ہو جانا چاہئے کہ کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے کے مقابلہ میں موت کو ہم آغوش کرنے کے لئے ہاتھ پھیلا دینا بہتر ہے، کام کاج نہ کرکے دُنیا کی نگاہوں میں بے عزتی اور عیب کا داغ لینے کے مقابلہ میں زہر کھا کر کے خودکشی کرلینا ہی قابل تحسین ہے، اپنی عورتوں کی حفاظت کرنے کے مقابلہ میں لاٹھی کی چوٹ سے مرجانا انسان کا فرض اعظم ہے، اسی لئے شریمتی سروجنی نائیڈو کے الفاظ میں آج ہمیں ان فرشتوں کی از حد ضرورت ہے کہ در بدر اعزاز ذاتی کی روشنی کو پہنچا دیں اور ہر ایک اچھوت کو تلقین کریں کہ تم اس شرف ذاتی کی روشنی سے اپنے اس خانہ احزان کو روشن کرو۔ اس گھر کو جس میں تم رہتے ہو، یہ مکان جو خاک سے بھرا ہوا ہے، یہ ناپاک مکان جسمیں ہوا کا دخل نہیں ہے جو تمہارا زنداں بن گیا ہے

اچھوت کے بہبود کی یہی بنیادی مشورت ہے اسی کی سعی سے، اسی کے مسلسل دورے، اسکے مکرر کرنے سے مُلک، قوم اور ذات کے سب رنج و الم معدوم ہونگے اور اسی اصلاح کے ثمر پھل کی

شکل میں مشرق کی جانب اس پُرانے ہندوستان کا آفتاب دوبارہ طلوع ہوگا۔

اچھوت اور تعلیم

لیکن اس اہم پہلو کی تکمیل کا امکان اُسی وقت ہوسکتا ہے جبکہ اچھوتوں کی تعلیم کا پورا انتظام کیا جائے اسی لئے ہم متفق الرائے ہیں کہ اچھوتوں کی ترقی کے سوال پر چاہے کسی بھی نگاہ سے غور کیا جائے لیکن جب تک اُس کے عملی پہلو میں تعلیم کو فوقیت دیجائیگی تب تک اُس کا تکملہ اور بارآوری نہیں ہوسکیگی۔ اس کہنے کی ضرورت نہیں کہ تعلیم زندگی انسانی کی صبح صادق ہے کہ جس کے انسان کی جملہ تدابیر لاحاصل ہوجاتی ہیں، یہاں تک کہ تلقین رُوح و تمیز رُوح دونوں صورتیں آنکھوں کے سامنے نہیں آتیں، یہی وجہ ہے کہ تعلیم کے پورے طور پر رواج دئے بغیر ذاتی اعزاز کی رگ کی قوت گمراہ ہوکر اپنے مرکز سے تجاوز کرجاتی ہے اور تیر بہدف نہیں ہوتی تعلیم کے بغیر بہادری دل آزاری میں مبدل ہوجاتی ہے، سادگی جہالت کا جامہ پہن لیتی ہے اور مذہب کٹرپن و تعصب کی صورت میں نمایاں ہونے لگتا ہے، کم ازکم ہماری یہ مستقل رائے ہے کہ تعلیم کے بغیر اچھوت ذات کے دل میں پیدا ہونے والا شرف ذات کا خیال ایک نہایت مہیب شکل اختیار کرسکتا ہے۔ بلا تعلیم کے اعزاز ذاتی کی بیداری کا انجام دوج (شایستہ قوم) قوم کی برطرفی اور نیز ہنود مذہب کا خاتمہ بھی ہوسکتا ہے، اگر ہمارا خیالی فرض کرنا نہیں ہے بلکہ حقیقت میں راستی کے احساس کے بھروسہ پر ہم ایسا کہنے کی جرأت کر رہے ہیں، جنھوں نے جنوبی رذیلوں کی زندگی کی بابت پڑھا ہے، وہ ہماری ان باتوں کا مضحکہ نہ اُڑادینگے، برہمن نیچوں کو مُردہ بشکل زندہ سمجھتے ہیں تو شاید نیچ براہمنوں کو مردہ مانتا ہے، کیونکہ جس طرح پر وہ برہمنوں کی گلیوں میں قدم نہیں رکھ سکتا اُسی طرح پر اُس کے محلہ میں بھی اگر شاید کوئی بھولا بھٹکا برہمن آپہنچتا ہے تو وہ گنگا جل اور گوبر کے ذریعہ سے اُس مقام کو پاک کرتا ہے، اسی لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ اچھوت کی تعلیم اور تعلیم آزادانہ دیجائے، کیونکہ اعلیٰ قوموں کے خوفناک گناہوں کا یہ نتیجہ ہے جو آج ایسی ہماری سخت پریشانی ہورہی ہے اور ہمیں جس طرح پر ارضی وسماوی مصائب کی آگ میں بال بال جلنا پڑ رہا ہے، اُسی گناہ کا بھروسہ اگر اچھوتوں نے بھی کیا، اگر وے بھی نفرت، دل آزاری، چوں و چرا اور نیز مغائرت کے خیالات سے متحرک ہوکر اعلےٰ قوموں کے ساتھ ویسا ہی سلوک کرنے لگے تو پھر ملک کا، اس جماعت کا بھلا نہ ہوگا، تب تو ایک ایسی زور شور کی آگ جل اُٹھیگی جس میں پُرانے زمانے کا ہندوستان، ہندوستانی شایستگی، آریوں کی شُستگی، قوم، ذات سب کی سب جل کر خاک سیاہ ہوجائیگی۔ اُس وقت کسکی طاقت ہے جو اِن کی

حفاظت کرے، دُنیا کی اُس محشر گاہ میں ہم اور یہ ہمارا پیارا ہندوستان پاش پاش ہو جائیگا؛ ہم محض اس خیال سے حواس باختہ، دم بخود اور بے جان سے ہو جاتے ہیں۔

لیکن محض اعزاز ذاتی کو متحرک کرنے کے لئے نہیں بلکہ اس قوت کو اُس کے ظہور و نیز ترقی کے لئے مستحکم سہارا، امداد کا میدان دینے کے لئے بھی اچھوت ذاتوں میں تعلیم کے رواج کی فکر نہایت ضروری ہے، ہندوستان کے مشہور دوسرے روشن ضمیر شاہنشاہ رام بادشاہ نے اپنے کلام پاک سے منور کیا ہے:۔

"سب سے بہترین تحفہ جو تم کسی شخص کو دے سکتے ہو وہ علم ہے، تم آج لوگوں کو کھانا کھلاتے ہو لیکن کل وہ پھر اُسی طرح بھوکا ہو جاتا ہے لیکن اگر تم اُسے کوئی ہنر سکھا دیتے ہو تو تم اُسے تمام زندگی کے لئے ذریعہ معاش پیدا کرنے کا دیدیتے ہو۔" اُس بزرگ کا کلام صداقت کے حسن سے کیسا خوبصورت ہے اور سچ پوچھئے تو اس کلام پاک میں اچھوتوں کے پیچیدہ مسئلہ کے ایک جزو اعظم کی آسان لیکن تعبیر کامل ہے، اس کو پایۂ ثبوت تک پہنچانے کی ضرورت نہیں کہ آج اچھوتوں کی زیادہ تر تعداد علم و ہنر کی تعلیم کے بغیر بے دست و پا ہو رہے ہیں اور انھیں بدرجہ مجبوری ان مذموم اور ناکردنی افعال کو کرنا پڑتا ہے جسکی وجہ سے ان کی دماغی نشو و نما اور جسمانی صحت پر بڑا اثر پڑتا ہے، ہم خود ایسے بہت سے شخصوں کو جانتے ہیں جو اچھوت قوم میں شائستہ ہوتے ہوئے علم و ہنر یافتہ ہونے کی وجہ سے پچاس سے سو تک کے تنخواہ دار ہیں اور خوشی و خرمی کے ساتھ اپنی زندگی بسر کر رہے ہیں، اس لئے اس بات کی نہایت ضرورت ہے کہ اچھوت ذات کے لئے آزادانہ طریق پر علم و ہنر کے مدارس کھولے جائیں، جہاں پر لکھنے پڑھنے اور تعلیم مذہب کے ساتھ ساتھ ایسے ایسے ہنر کی تعلیم دی جاے جس سے وے اپنی معاش پیدا کرنے کے قابل ہو جائیں اور انھیں اپنے زمانۂ موجودہ کی بری زندگی کے مصائب سے نجات ہو جائے ہندوستانی بزرگ لوگوں نے اپنے چشم باطن سے جو علاج بتلایا ہے اُس کے عجیب و غریب اثر اور قوت میں شک کرنا کسی نظر سے ٹھیک نہیں یوں بھی اتنی راست، خوبصورت اور مفید باتیں ہیں، کہ اُس کو اپنی قوت کی صداقت کے لئے متعدد ثبوت بذریعہ دلیل و حوالہ کی ضرورت نہیں ہے۔

تعلیم اور بے عنوانی

لیکن اچھوتوں کے معاش کے پیچیدہ سوال کا فیصلہ کرنا ہی تعلیم کا محض مقصد نہیں ہے، اُسکا دُوسرا اور بھی پاک اعلیٰ تر و نیز بزرگ مقصد ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اچھوتوں کو اُن کے آبائی سلسلہ بے عنوانیوں سے آزاد کرنا، جس نے اُن کی ذاتی، روحانی، جسمانی و نیز اخلاقی زیست کو

تیہ و تار اور خالی از چین و آرام کر دیا ہے، اُسی کا مختصر
تذکرہ اب ہم کرتے ہیں۔

سب سے پہلے شخصی زلیست پر نظر ڈالئے۔ صدیوں
کی مسلسل افتادونے اُن میں، مرد و عورت دونوں میں
بہت سی بُری عادتیں پیدا کر دی ہیں، ان کی وجہ
سے شایستہ لوگوں میں بہت سے شایستہ لوگ انکے
ساتھ کامل ہمدردی کرتے ہوئے بھی اُن سے بلا خوف
تعلق رکھنے میں پس و پیش کرتے ہیں، اس مختصر نوٹ
میں اُن سب باتوں کا تذکرہ کرنا ممکن نہیں لیکن
بطور نمونہ ہم محض ایک ہی بات ناظرین کے رُوبرُو
رکھتے ہیں، وہ ذاتی صفائی کی طرف سے بالکل عدم
توجہی ہے، وے مہینوں تک نہاتے نہیں، ان کے
بال مسکن جوں ہوتے ہیں، ان کے کپڑے مجمع آلایش
کے خزاین ہوتے ہیں اور اُن کے دانتوں پر تو
شاید آدھ انچ موٹی میل جمی رہتی ہے، گندگی انکی
نس نس میں گھس گئی ہے، یوں کہئے کہ گندگی کو
اُنھوں نے اپنا دوامی ساتھی بنا لیا ہے، اس میں
شک نہیں کہ صدیوں کے بُرے برتاؤ اور زبردست
افلاس کی مہیب مہمانی بھی ان کی اس گندگی کے
اصلی وجوہات میں سے ہے، لیکن پھر بھی وے اگر
چاہتے تو اپنے جسم کو صاف رکھ سکتے تھے، اسی
گندگی کا اثر اُن کی تندرستی پر بھی بہت زبردست
پڑتا ہے۔

تمدنی زلیست بھی ایک طور پر معدوم ہے
چوری کرنا، و نیز جھوٹ بولنا تو گویا اُن کے
لئے ازحد معمولی بات سی ہو رہی ہے۔
اسی طرح پر اُن کے متعدد افعال میں
بھی ازحد زوال اور بڑی ذلت کا شمول ہے۔
اُن کی روحانی زندگی تو لگ بھگ نیست و نابود
کے برابر ہے، روحانی تسلی کو تو وہ حاصل ہی
نہیں کر سکتے، کیونکہ اُن کا رہن سہن اُنکی مجموعی زلیست
اور اُن کی شخصی زندگی سب کے سب یعنی روحانی
زلیست کو سیاہ اور پلید کرتے رہتے ہیں۔

قانون قدرت کی جس قدر خلاف ورزی ہے
اُسی کے رُو سے ہم نے اُن کی جانچ پڑتال کی ہے
اُس میں بھی خلاف ورزیوں کا یک قلم عدم
نہیں ہے۔ انتجوں اور اچھوتوں میں سچے فقرا
اور سیدھے سادے لوگ کا پایا جانا ناممکن نہیں ہے
اُن میں بھی بہادر، اپنے بات کے پکے، قول کے
سچے، خدا پرست اور برداشت کرنے والے لوگ پائے
جاتے ہیں، لیکن ہم نے تو کثرت کو پیش نظر رکھکر یہ
جانچ کی ہے۔

تب تعلیم کے ذریعہ سے اُن کی ان بدرواجیوں کو
دُور کرنا ہوگا، اُن کو بتلانا ہوگا کہ صفائی جسم و دل
ازحد ضروری ہے اور صفائی قلب خدا رسی کے نام کا
پہلا زینہ ہے۔ اُن کو بتلانا ہوگا کہ جھوٹ بولنا، چوری
کرنا، گالی بکنا، بے وجہ مار پیٹ کرنا، گوشت شراب
کھانا پینا اور زنا کرنا وغیرہ ممنوع ہیں اور زندگی کی رفعت
پاکی و نیز شرافت کے حصول کے لئے راست کلامی، رحم،
عفو وغیرہ نیک صفات کی عادت و نیز اپنی ذات وغیرہ ذات

ماروواڑ کے خاص باجے (نوبت و شہنائي)

ماروواڑ کے دیہات کي زندگي کا ایک نظارہ

ماروواڑ کے دیہات کي زندگي

ماروواڑ کي گئے

امباری ہودے کے ساتھ راجاؤں کا ہاتھی

مارواڑی کسان کی دو پہیہ کی بیل گاڑی

جودھپور کا قلعہ

[یہ قلعہ قرب و جوار سے ۴۰۰ فٹ کی بلندی پر تعمیر کرایا گیا ہے ۔]

کی مستورات کو مادرِ دہر کی طرح ماننا ہر ایک صاحب مذہب کا فرض ہے، جو دُنیا کے پیدا کرنے والے کا پیارا بننا چاہتا ہے اور اسی طرح اُنھیں یہ بھی سمجھانا ہوگا کہ یہی عالم فانی سب کچھ نہیں ہے، اس کے علاوہ بھی ایک اور عالم ہے زلیست کا خاتمہ دامن قبر ہی تک نہیں ہو جاتا ہے بلکہ مرنے کے بعد بھی یہ زندگی پیش نظر رہتی ہے، ہمارے چاروں طرف جو خوبی وحسن کا انبار لگا ہوا ہے اُس میں کوئی اعلیٰ قوت کا تماشا دکھلائی پڑتا ہے، جسے ہندو جگدیشور، مسلمان اللہ، عیسائی لارڈ، اسی طرح پر مختلف مذاہب والے مختلف ناموں سے پکارتے ہیں، اس طرح پر اچھوتوں کو بھی پستی سے بلندی پر لانا ہوگا، اُنھیں بھی ہندو مذہب کے منہدم محل کے ازسرِنو تعمیر میں امداد دینے کے لئے تعلیم دیکر قابل بنانا ہوگا۔ اس میں محض اچھوتوں کا ہی نفع نہیں ہے بلکہ ہماری بھی مطلب براری ہو جاتی ہے، مہاتما رام کا کلام ہے "اُس وقت تک کوئی بھی انسان یون بھگوان کے ساتھ یکجہتی کا احساس نہیں کرسکتا جب تک کہ اُس کے جسم کے ریشہ ریشہ میں تمام عالم کے جملہ ذاتوں کے ساتھ یک جہتی کا ترانہ نہ اُٹھنے لگے"

اس کلام صادق کو ہم بالیقین بسر و چشم تسلیم کرتے ہیں۔

اپنی اپنی سمجھ

میاں بی بی رات کو سو رہے تھے، کچھ کھٹکا ہوا، بی بی نے کہا دیکھو تو شاید کوئی چور ہے" میاں نے کمرے کے قریب پہنچ کے آواز دی کون ہے، جواب ملا "کوئی نہیں" جواب قابل اطمینان تھا، صرف صبح کو چند چیزیں گھر سے غائب تھیں، معلوم نہیں کیا اتفاق ہوا۔

اُستاد نے لڑکے سے پوچھا "دُنیا میں سب سے زیادہ امیر آدمی کون ہے"، لڑکے نے فوراً جواب دیا۔ "سر ہنری لاڈر" اُستاد کو یہ سُنکر تعجب ہوا مگر قبل اس کے کہ کوئی سوال پوچھا جائے لڑکا بولا "اس کی وجہ یہ ہے کہ راکفیلر وغیرہ روپیہ خرچ بھی کرتے ہیں مگر سر ہنری لاڈر صرف پیدا کرتا ہے۔

اسی قصہ کے مماثل واقعہ ہے کہ ایک کنجوس صاحب گنگا نہانے گئے، پنڈوں سے بچنے کے واسطے ایک ویران جگہ نہانے لگے مگر شامتِ اعمال جب نہا کر نکلے تو ایک برہمن نظر آیا اور "داتا کا بھلا" کہکر خیرات کا خواستگار ہوا، بنئے نے کہا مہراج چندن بھی تو دلواؤ پھر پیسہ مانگنا، برہمن دیوتا بولے "صاحب چندن نہیں ہے مگر لیجئے گنگا جی کی مٹی لگا لیجئے اشلوک ہے۔ "گنگا جی کی ریڑن کا ملیا گیر سمان"

بنئے نے ایک چھوٹی سی مینڈکی پکڑی اور کہا مہاراج یہ بھی اشلوک ہے "گنگا جی کی مینڈکی کپلا دھین سمان"

"لے چلی تدبیر مجھکو سامنے تقدیر کے"

[عالی جناب تاج الشعراء ناخدائے سخن حضرت نوح ناروی]

جانچ لے اے دیکھنے والے دل نخچیر کے — کتنے قطرے خون کے ہیں کتنے ٹکڑے تیر کے
جو کبھی قائل نہ تھے جذبات پُر تاثیر کے — اب گریباں گیر ہیں وہ اپنے دامن گیر کے
کہدئے حالات عشق و حُسن کی تاثیر کے — ہر زباں میں ترجمے ہونگے مری تقریر کے
مرگئے ہم مٹ گئے ارمان بھی تاثیر کے — دن پھرے اتنے دنوں میں نالۂ شبگیر کے
آگیا میری سمجھ میں عیش و غم کا فلسفہ — دیکھکر نقشے تمھاری دو رُخی تصویر کے
دیکھئے ہوتا ہے کیا اُس کی سفارش کا اثر — لے چلی تدبیر مجھکو سامنے تقدیر کے
آپ اندازہ کریں اس سے مرے آزار کا — دل جہاں تھا اب وہاں ہیں چند پیکاں تیر کے
کیا کروں سعیِ رہائی کچھ پتہ چلتا نہیں — اس طرح جوڑے گئے دونوں سرے زنجیر کے
آئیں اور آکر مری آنکھوں سے تم کو دیکھ جائیں — قدر کرنے والے ہنستی بولتی تصویر کے
ہوگئی میری ہوائے شوق بھی تیری طرف — اُڑ گئے دامن سے ذرے خاک دامن گیر کے
کیوں خدائی پر نظر ڈالیں نہ صاحبانِ خدا — ہے مصوّر بھی نہاں پردے میں اس تصویر کے
تھی بیانِ شوق پر جتنی تری نیچی نِگاہ — اُتنے ہی ہیں میرے دل میں زخم گہرے تیر کے
آستیں ہے جیب بے دامن ہے اے دستِ جنوں — مل رہیں گے ہر کہیں ٹکڑے تری تقدیر کے
شور ہے دُنیائے اُلفت میں نشانہ اُڑ گیا — مل گئے کیا میرے دل کو پر تمھارے تیر کے
فیض کچھ پہنچے نہ پہنچے ہم کو اے اہلِ جنوں — سلسلے میں آج داخل ہوگئے زنجیر کے
واقعاتِ عشق پر ڈالو نہ معمولی نِگاہ — یہ تماشے دل کے ہیں یہ کھیل ہیں تقدیر کے
سب نے آنکھوں میں نگاہوں میں لونہیں دی جگہ — سیکڑوں گھر بن گئے ایک آپ کی تصویر کے
کوچۂ اُلفت میں دی تقدیر نے مجھکو شکست — میں چلا تھا اپنے گھر سے زور پر تقدیر کے
اہلِ زنداں یہ سمجھ لیں موسمِ گُل آگیا — گر پڑیں جب ٹوٹ کر حلقے مری زنجیر کے
دل میں آیا دلمیں بیٹھا دل میں تو گھر کر چکا — لیکن اب کھُلتا نہیں کیا ہیں ارادے تیر کے

تھے وہ کچھ کہنے کو لیکن چل دیا زنداں سے میں — رہ گئے منہ کھول کر حلقے مری زنجیر کے
کیسے آئے کیسے ہو کیسا ہے جی کیسا مزاج — بس یہی دو چار فقرے ہیں عمل تسخیر کے
میں اگر دل میں چھپاتا ہوں تو میرے جسم پر — رہ گئے بن کر اُبھر آتے ہیں ٹکڑے تیر کے
خاک چھنوائی تھی الفت ہم سے کوئے یار میں — اتفاقاً چند نسخے مل گئے اکسیر کے
بے وفا کو روک کر عہدِ وفا لے ہی لیا — ہمت کھنڈے ہیں کیا ہمارے دستِ دامنگیر کے
ہے عناصر پر جہاں میں جسم انساں کا قیام — چار رُخ چار آئینے ہیں ایک ہی تصویر کے
زور دے کر دفعتاً پہلو سے کھینچوں کس طرح — دل بھی ہوگا آگے پیچھے دہنے بائیں تیر کے
اس ادا سے بھی تری کم التفاتی کھل گئی — اے مرے کھنچوانے والے نیم رُخ تصویر کے

نوح سے وہ پوچھتے ہیں اس طرح مدت کی بات
کیا تمھیں باعث تھے اُس طوفان عالم گیر کے

خاص

اپنی اپنی سمجھ

ایک عورت ۔ "کیوں بہن! کیا اپنے ہاتھ سے کھانا بنانے میں فائدہ اور کفایت ہے؟"

دوسری عورت ۔ "ہاں بہن، جب سے میں پکاتی ہوں میرا مرد جتنا پہلے کھاتا تھا اب اُس کا آدھا بھی نہیں کھاتا۔"

بیوی ۔ "میں نے تم سے اس لئے شادی کی تھی کہ تم پر مجھے ترس آگیا تھا، تم سے تو کوئی بات بھی نہیں پوچھتا تھا۔"

میاں ۔ "مگر اب تو سبھی مجھ پر ترس کھاتے ہیں۔"

احمد ۔ کیوں محمود، اپنی عورت کے بھاگ جانے پر اتنا رنج کیوں کرتے ہو؟ جانے دو۔"

محمود ۔ "نہیں، اس کا رنج نہیں ہے۔"

احمد ۔ "(گھبرا کر) پھر کس بات کا رنج ہے؟"

محمود ۔ "کہیں وہ کمبخت پھر نہ چلی آئے۔"

لڑکی ۔ "(اپنی ماں سے) ماں! اسکول کی پڑھائی اب ختم ہوگئی، اب میں کالج جاؤنگی۔"

ماں ۔ "نہیں! اب تُو بیاہنے کے لائق ہوگئی، پھر مرد تو اس بات کی بالکل ہی پرواہ نہیں کرتے کہ بیوی پڑھی ہے یا بے پڑھی۔"

لڑکی ۔ "ماں! تم میں یہی تو سخت عیب ہے، تم سب مردوں کو میرے باپ کی طرح سمجھتی ہو۔"

"میں تمھاری محبت میں جل رہا ہوں"

"ــ ھائی تم ــ ایندھن ہو رہے ہو؟"

دولہن

کوئی سمجھے یا نہ سمجھے میں تو سمجھا لفظ لفظ -
چپکے چپکے کہہ دیا سب القصہ تیری تصویر نے -

معاملہ واحد ہے

[پروفیسر غلام سرور صاحب ایم، اے، علیگڈھ یونیورسٹی]

دنیا میں بلنے کا مرض ایسا عام ہے کہ شاذ و نادر ہی کوئی شخص اس سے بچا ہوگا، فرق ہے تو صرف مرض کی شدت کا، ورنہ اس کے جراثیم ہر ایک میں پائے جاتے ہیں، جہاں حالات ذرا موافق ہوئے انھوں نے غلبہ کیا اور پھر شکار کو ایسا دبایا کہ تمام عمر پنجہ سے نہ نکل سکا، گو دنیا کے محققان طب نے تجسس و تحقیق سے ہزارہا نکات پر جو پہلے پردۂ راز میں مستور تھے روشنی ڈالی ہے مگر کسی نے اس مرض کی ماہیت پر غور نہیں کیا، معلوم نہیں اسکے اسباب کیا ہیں؟ فطرتی کمزوری، تربیت کا نقص، نواحیات کا اثر یا دماغ کی کسی چول کا ڈھیلا ہونا، بعض طبائع اس کا اثر قبول کرنے کے لئے زیادہ مستعد ہوتی ہیں بلکہ بعض اوقات تو صرف ایک بہانا چاہئے۔ اسباب متذکرۂ بالا میں سے کسی ایک کی وجہ سے جب طبیعت کا توازن ذرا بگڑا تو مرض نے زور کیا اور جب ایک دفعہ اس کا حملہ شروع ہوگیا تو پھر نجات مشکل ہے، مزمن صورت اختیار کرلیتا ہے۔ کوئی نکتہ چینی، مذاق، پھبتی، نصیحت کارگر نہیں ہوتی، اس کا مریض اشارے کنائے کو تو کچھ سمجھتا ہی نہیں بلکہ ایسے شخص کو اشارے سے سمجھانے کی کوشش کرنا اندھے کے آگے رونا ہے، کچھ ایسی کچے گھڑے کی چڑھی ہوتی ہے کہ خواہ کوئی منہ پھٹ صاف طور پر قلعی کھولدے۔ کچا چٹھا بلاکم و کاست بیان کردے مگر پھر بھی کچھ اثر نہیں ہوتا، بس یوں سمجھئے کہ بط کے پروں پر سے مٹکوں پانی پھسل گیا، ضایع ہوا پانی، پر ویسے کے ویسے۔

یہ مرض عالم گیر ہے، دنیا کا کوئی گوشہ اسکی دستبرد سے بچا ہوا نظر نہیں آتا، مختلف اقوام کو اپنی "تہذیب" و "ترقی" پر ناز ہوتا ہے جسکو وہ دنیا کی دیگر اقوام کے گلے میں ان کو "بد تہذیب" یا "بے تہذیب" ٹھہراکر بنوک شمشیر یا بدہانِ توپ ٹھونسنے کی کوشش کرتی ہیں، سچ ہے مریض دوائی کے اوصاف کیا جانے، اسی لئے معالج بعض اوقات حلق میں انگلی ٹھونستا ہے، جن اقوام کا دورِ عروج گذر چکا ہو تو وہ یونانیوں، رومیوں، ایرانیوں یا ہندوستانیوں کی طرح اپنے آبا و اجداد کے کارناموں ہی کو پیش کرکے اپنی تسلی کرلیتی ہیں، مقصد ایک ہی

ہے، کسی نے "ہمچو ما دیگرے نیست" کہکر دنیا کو مرعوب کرنا چاہا اور کسی نے "پدرم سلطان بود" کی رٹ لگا کر اپنا دل خوش کرلیا۔

اقوام سے گذر کر اب سوسائٹی کے مختلف گروہوں کو لیجئے، دُکانداروں کو اپنی دولتمندی کا زعم ہوتا ہے لالہ جی چاہے دیوالیہ ہی ہوں مگر کہلائینگے سیٹھ جی طلباء کو اپنی معلومات پر ناز ہوتا ہے، بقراط و سقراط سے لیکر آج تک جتنے بڑے بڑے عالم و فاضل اور محقق ہوئے ہیں کوئی ان کی نظروں میں نہیں جچتا قدم گو اُن کے زمین پر ہیں مگر سر اس غرور علم کی وجہ سے آسمان کو چھیدتے ہوئے کہیں نکل جاتے ہیں سپاہیوں کو اپنی بیباکی و بے جگری پر فخر ہوتا ہے خواہ لڑائی کا تام "شکر سیل رواں" کا ایسا نقشہ بندھے کہ کوئی جتن کارگر نہ ہو اور سورما بہادر کو لڑائی کی بے وقت موت سے بچنے کے لئے پانی میں گھلے ہوئے صابون کی "دستگیری" کی تمنا ہو، مولویوں کو اپنے علم و فضل اور زہد و تقویٰ پر گھمنڈ ہوتا ہے گو غور سے سُننے پر ان کا دعویٰ محض ڈھول کی آواز ثابت ہو۔ ڈاکٹروں اور حکیموں کو اپنی مسیحا نفسی کا دعویٰ ہوتا ہے خواہ وہ ملک الموت کے ساتھ ہی ہوں، الغرض اس مرض کا زہر مختلف مقدار میں ہر ایک میں پایا جاتا ہے سوسائٹی کے مختلف طبقات بعد کے خاندانوں اور پھر مختلف افراد کا نمبر آتا ہے، کئی خاندانوں میں تو یہ مرض تپ دق، سل اور آتشک کی طرح موروثی ہوتا ہے، سالخوردہ دادا جان سے لیکر "گو ایڈیشن" ننھے میاں تک سب ایک ہی رنگ میں رنگے نظر آتے ہیں، ادھر ننھے میاں نے ہوش سنبھالا اور "ہمارے ابا" "ہماری اماں" کا ورد شروع ہوا۔ انانیت کا تعلق عمر سے ہے اس لئے چھوٹے بچّے کی ذات خودسرائی سے بے نیاز ہوتی ہے، وہ صرف ابا جان کے عالم و فاضل یا "بڑا صاحب" یا رستم ثانی ہونے یا اماں جان کے سلیقے یا حُسن کا اعلان کرتا ہے۔ گو اس راگ میں کبھی کبھی ہمالی ڈلیا (گڑیا) ہمالی پوپی (ٹوپی) ہمالی دولی (جوتی) یا ہمالے پپلے (کپڑے)، کی سُر بھی سُنائی دیجاتی ہے مگر اس کا مقصد صرف اماں اور ابا کی فیاضی کا اظہار ہے اور بچے کی منشاء صرف یہ ہوتی ہے کہ ان باتوں سے مخاطب کی توجّہ اپنی طرف مبذول کرکے اسے دُنیا کے تمام اوصاف کے مرکز کی طرف جسے وہ ابا، اماں سے تعبیر کرتا ہے رجوع کردے، صغرسنی میں وہ صرف ایک واسطہ ہوتا ہے جس کا کام اس مدح سرائی سے لوگوں کی توجہ جذب کرکے آگے منزل مقصود پر پہنچانا ہے، اس مدح سرائی سے کچھ عرصہ کے بعد بھائی جان اور آپا جان بھی علیٰ قدر مراتب مستفیض ہونے لگتے ہیں، گو ان کی مدح کے لئے سُریں ذرا مدھم منتخب کی جاتی ہیں مُرورِ زمانہ کے ساتھ بچے کی توجّہ اپنی ذات کی طرف مبذول ہوتی ہے اور اس "خاندانی گیت" میں وہ رفتہ رفتہ اپنے آپ کو شامل کرتا جاتا ہے حتیٰ کہ والدین کی آنکھوں کا نور، دل کا سُرور یہ نونہال اس ترتیب کے تمام

مراحل طے کر کے " خاندان سرائی " میں پختہ ہو جاتا ہے اور اس تکمیل سے " خاندانی گیت " کا کورس مکمل ہو جاتا ہے مگر سب سے آخری اور بلند سُر وہ ہوتی ہے جس میں صرف " میں " کی آواز نکلتی ہے اور اس کا تعلق اس زمانہ سے ہے جبکہ انسان بچپن کے سب مراحل طے کر کے جوانی کے اس حصے کو پہنچتا ہے جہاں کہ خاندان کے باقی افراد سے علیحدہ ہو کر اس کی افرادی زندگی شروع ہوتی ہے، اس وقت وہ سب کو اماں، ابا، آپا، بھائی سب کو بھولکر " میں " کی پرستش شروع کرتا ہے، جب اس کی شادی ہو جاتی ہے اور شادی کا لازمی نتیجہ بھی نکل آتا ہے یعنی کسی خاص امر کے مانع نہ ہونے کی وجہ سے بچے پیدا ہو جاتے ہیں تو انانیت کا یہ دیوتا اپنی دیوی کے ہمراہ اپنے گھر کے تخت پر متمکن ہو جاتا ہے اور اس کے بچے دن رات اپنی عقیدت و نیازمندی کے پھول اس پر نچھاور کرتے ہیں اور دُنیا کو دعوت دیتے ہیں کہ اس مدح سرائی میں شامل ہو، کوئی مانے یا نہ مانے اس کی اپنی مرضی۔

جس طرح مختلف امراض مختلف جگہوں میں حالات کے مطابق صورت اختیار کرلتے ہیں اسی طرح یہ مرض بھی مختلف علاقوں میں مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے، مثلاً ہندوستان کو لیجئے، بمبئی میں ہر شخص کو دولتمندی کا گھمنڈ ہے، جسے پوچھو سیٹھ صاحب ہے۔ صوبہ سرحد میں ہر شخص " خان " ہے حتیٰ کہ اکثر ہندو بھی اپنے نام کے ساتھ " خان " لکھتے ہیں پنجاب میں ہر شخص کو لیڈری کا دعویٰ ہے، تحریک عدم تعاون لیڈر سازی کی مشین تھی، جو شخص دو ماہ حوالات ہی میں گذار آیا لیڈر بن گیا یا جس وکیل کی وکالت نہ چلی اس نے یہ پیشہ اختیار کرلیا پلیٹ فارم پر کھڑے ہو کر گورنمنٹ کو گالیاں دینی شروع کیں، رپورٹ ہوئی، جیل خانے گئے، کچھ عرصہ کے لئے سرکاری مہمان رہے، خوراک مفت، پوشاک مفت، رہائش مفت، رہائی ہوئی تو پورے لیڈر بس پھر کیا ہے، یاروں کی چاندی ہی چاندی ہے۔ وکالت علیحدہ چل نکلی اور کسی " کارِ خیر " کے لئے چندہ جمع کرنا علیحدہ شروع کیا، دہلی اور لکھنؤ میں ہر ایک شخص مغلیہ خاندان یا شاہان اودھ کے خاندان سے ہے جس کی شہادت ان دعویداروں کی خستہ حالی ہے۔ الغرض اس مرض کا زہر دنیا کے ریشے ریشے میں سرایت کر گیا ہے۔

اس مرض کے ایک مریض میرزا سلیم بیگ عرف چھمو میرزا دہلوی تھے، کچھ تو خاندانی تربیت کا اثر کچھ دہلی کی فضا کا، اس پر چند بگڑے دل دوستوں کا دل لگی کی خاطر اُٹھتے بیٹھتے شہ دینا، ہر وقت " ہمچو ما دیگرے نیست " اور " پدرم سلطان بود " وردِ زبان تھا، باوجودیکہ گریجویٹ اور سکریٹریٹ پر معقول عہدے پر تھے مگر تعلیم اور ملازمت نے طبیعت میں کوئی سنجیدگی پیدا نہ کی تھی بلکہ انانیت کا پیالہ جو پہلے ہی لبالب تھا چھلک اُٹھا، مسلمان کی جیب میں چار پیسے ہوں تو وہ فرعون نہیں بنے گا تو اور کیا کریگا، سب سے زیادہ ان کو اپنے خاندان پر بہت

تاز تھا، کئی میلوں کا چکر دیکر اور کھینچ گھسیٹ کر
وہ اپنے آپ کو آخری تاجدار دہلی کے قریب لے آئے
جیب میں ہر وقت چکنے کاغذ پر ایک تازہ بتازہ
نقل کیا ہوا شجرۂ نسب رکھتے؛ انگریزوں کے
کس کس ظلم کو روئیں، اجازت نہیں کہ وقارِ خاندانی
کے تحفظ کے لئے کوئی ہتھیار اپنے پاس رکھ سکے۔
لہٰذا وہ اسی کاغذی حربے سے کام لیتے، کسی نے
خفیف سے شبہہ کا اظہار کیا اور آنکھیں گڑھوں سے
باہر نکل آئیں، بدن میں غصہ سے رعشہ پڑ گیا، شجرہ
کا کاغذ کھٹ سے سامنے ڈالدیا گیا اور کانپتی ہوئی
اُنگلی نے اس کاغذی میدان پر بابر سے لیکر میرزا
سلیم بیگ تک جگہ جگہ اٹکتی ہوئی مسافت طے
کرنی شروع کی، تاریخ میں کوئی نام جس کے ساتھ
لفظ "بیگ" منسلک ہوتا اس قرابت داری سے نہ
بچتا، یہ تو غنیمت ہے کہ محض اختصار کی خاطر یہ
سلسلہ بابر سے شروع ہوتا تھا ورنہ معترض صاحب
کو منگولیا، تاتار اور نہ معلوم کن کن ملکوں کے
جنگلوں کی خاک چھاننی پڑتی، کچھ تو مروتاً اور کچھ
کوفت و پریشانی کے ڈر سے کسی کو اس ریسرچ
کی جرأت نہ ہوتی، ہر ممکن طریقہ سے پہلو بچاتے
لیکن اگر کسی مسخرے نے ہر روز کے پریشان کن
دعووں سے تنگ آکر غیر معمول جسارت سے کام
لیا اور "دل افگندیم بسم اللہ" کہکر اس تاریک
کنویں میں اُترنے کی ہمت کی تو محل شاہی تک
پہنچنے کے لئے اسے کئی تنگ و تاریک اور پیچدار گلیوں
میں سے گذرنا پڑا، جہاں کہیں غلاظت کے ڈھیر بھی
پڑے ملے اور محل شاہی تک پہنچے بھی تو پچھلے دروازے
سے مگر واہ رے میرزا صاحب کی "وضعداری" حقیقت
آشکار ہونے پر بھی وہی دم خم تھے، ایک نشہ تھا
کہ کسی تُرشی سے نہ اُترتا اور ایک رنگ تھا کہ کسی
کاٹ سے دُور نہ ہوتا۔

میرزا صاحب کی رنگت، اُن کی وضع قطع اُنکے
خط و خال انکے دعوے کا صریح اعلان تھے، گال پچکے
ہوئے، آنکھیں اندر دھنسی ہوئیں، معلوم ہوتا تھا کہ
قدرت نے بنائی نہیں بلکہ کھوپڑی میں زور سے کھینچکر
دے ماری ہیں، جس سے وہ دور تک گھستی ہوئی
چلی گئی تھیں، ٹھوڑی پر صرف قسم کھانے کو چند
بال، باقی چہرے پر جھریوں کا ایک گھنا جال جس سے
گمان ہوتا تھا کہ ہل چلاکر بیج تو ڈالا گیا تھا مگر
اُگا کچھ نہیں، رنگت کا یہ عالم تھا کہ جب کبھی کوئی
کریم یا روغن چہرے پر لگا لیتے تو سیاہ وارنش کا
جوتا یاد آتا، سیاہی کی چمک ایسی کہ بلا مبالغہ قریب
والے کے چہرے کا دھندلا سا خاکہ نظر آجائے، اگر
کوئی بدتمیز سوال کرتا کہ حضرت مغل اور سیاہ رنگ
تو فرماتے کہ آب و ہوا کا اثر ہے، اس "بھٹی"
(ہندوستان) میں رہتے ہوئے صدیاں گذرگئی ہیں
انگریزوں کو دیکھئے چند ہی سال میں ان کا رنگ
سانولا ہو جاتا ہے، جواب معقول ہے،

سوال کنندہ اپنا سا منہ لیکر رہ جاتا۔
خاندان کے بعد میرزا صاحب کو اپنی شہزوری پر بہت ناز تھا، بدن پر گوشت کا نام نہ تھا، ہڈیاں جوڑ کر کھال منڈھ دیگئی تھی۔ ہر ایک عضو کی ساخت میں قدرت نے " ہرچہ گیرد مختصر گیرد" کو مد نظر رکھا تھا، کپڑے پہننے سے معلوم ہوتا تھا کہ کٹھ باگھ؎ کھیت سے بھاگ نکلا ہے مگر اپنے ننھے ننھے ہاتھوں کے گھونسہ دکھاکر فرماتے کہ ہڈیاں نہیں فولاد ہے، فولاد۔ اگر ہاتھی کے سر پر گھونسہ ماروں تو کھوپڑی چور چور ہو جائے، شیر کے منہ میں پنجہ ڈالدوں تو زبان کھینچ کر لے آؤں گو ضیق النفس کی وجہ سے آواز نہ نکلتی مگر فرماتے کہ میرا نعرہ نعرۂ حیدری کو شرماتا ہے، اپنے حسن و رعنائی کا یہ دعویٰ تھا کہ اپنے دوستوں کو نت نئی "کامیابی" کی داستانوں سے محظوظ فرماتے، پہلے تو بدیشی مال سے رغبت تھی مگر جب سے تحریک عدم تعاون شروع ہوئی اور سودیشی کا چرچا بڑھا تو حب الوطنی نے جوش مارا، اس لئے اپنے ملک کی "پیداوار" کو ممنون کرم فرمانے لگے، جب کبھی سُرور زیادہ ہوتا تو فرماتے کہ میرا حُسن، مردانہ حسن ہے، جدھر نکل جاتا ہوں آنکھیں اُٹھتی ہیں، ڈاک سے ہر روز بیسوں خط آتے ہیں، کسی کے دل میں ناسور ہو گیا ہے، کسی کے جگر میں پھوڑا کوئی غم فراق میں کانٹوں پر لوٹتی ہے، کوئی جدائی کی راتیں اختر شماری میں بسر کرتی ہے، جب خط کھولتا ہوں تو کاغذ کے کڑکڑانے سے دلوں کے چٹکنے اور آہوں کی صدا پیدا ہوتی ہے، یار لوگوں کو ایک مشغلہ مل گیا تھا، جب کبھی طبیعت اُکتائی اس انسانی گراموفون کی چابی گھمائی اور ریکارڈ بجنے لگا، خوب بناتے اور ہنسی اُڑاتے، انکی جرأت کا یہ عالم تھا کہ دفتر کے سپرنٹنڈنٹ کو تو کسی خیال ہی میں نہ لاتے، بات بات پر سکتر سے لڑ جانے کو تیار ہو جاتے، وہ تو خیریت گذرتی کہ یار لوگ پکڑ لیتے، ٹھنڈا پانی پلاتے، اگر دورے کی شدت ہوتی تو ٹوپی اُتار کر سر پر ٹھنڈے پانی کا تریڑا دیتے، پنکھا ہلاتے ورنہ معلوم نہیں کیا گذرتی، گورنمنٹ کو ہر روز ایک نیا سکرٹیری مقرر کرنا پڑتا، بہت اُچھلتے کودتے اور غل مچاتے کہ بس یا تو آج سکتر صاحب رہے یا اپنا استعفا داخل، الغرض میرزا صاحب مجسم انانیت یا "میں" یا "ہم" تھے۔ کسی مضمون پر بحث ہو وہ اپنی رائے ضرور دیتے۔ اور اصرار یہ کہ اُن کا لفظ وحی اور حدیث ہے۔

اس انانیت کی وجہ سے میرزا صاحب کسی سے مرعوب نہ ہوتے، کسی بڑے سے بڑے جرنیل، مدبّر، فلاسفر، مصنف، سیاح کی ان کے سامنے کچھ حقیقت نہ تھی، ہر ایک میں کوئی نہ کوئی عیب نکال کر رکھدیتے، مگر "ہر فرعونے راموسیٰ" ایک ہستی سے ان کی جان جاتی رُوح فنا ہوتی، اس کا ذکر آتے ہی بدن میں رعشہ پڑ جاتا، ٹانگیں لڑکھڑا جاتیں، گو

؎ Scare Crow

دوستوں کے روبرو اپنی "وضعداری" قائم رکھنے کی بزور کوشش کرتے مگر یار لوگوں نے بھانپ لیا تھا کہ یہاں پانی مرتا ہے، جب کبھی وہ کسی معاملے میں حد سے زیادہ مغز چاٹنا شروع کر دیتے اور کسی جتن سے چُپ نہ ہوتے تو ان کے دوست اس موضوع پر گفتگو شروع کر دیتے، بس پھر کیا تھا گویا چھ سلنڈر والی موٹر کو جو ساٹھ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے جا رہی ہو چاروں بریک لگ گئے۔ سب لساتی کافور ہو جاتی، زبان اس طرح بند ہوتی گویا مادرزاد گونگے ہیں، پھر یار لوگوں کی بن آتی بہت کوشش کرتے کہ زبان کھولیں مگر وہاں چپ کا روزہ شروع ہو جاتا "ہوم گورنمنٹ" کی جابرانہ پالیسی سے اس قدر خائف تھے کہ اس کے خلاف ایک لفظ کہنے کی بھی جرأت نہ پڑتی، تمام چوکڑیاں بھول جاتے، نشہ کافور ہو جاتا، گو وضع قائم رکھنے کی خاطر بہت ہاتھ پاؤں مارتے مگر بے سود، اُڑنے کی کوشش کرتے مگر پَر جواب دیدیتے، انکی "نصف بہتر" نے ان پر کچھ ایسا سکہ جمالیا تھا کہ نظروں سے اوجھل ہونے کے باوجود بھی میرزا صاحب کو جرأت نہ ہوتی کہ کوئی بات منہ سے نکالیں۔ بات بات میں، قدم قدم پر اس کی رضامندی مطلوب تھی، اگر کبھی دوست انھیں اس معاملہ پر بہت ہی دِق کرتے تو یہ کہکر کہ "میاں ذرا اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھو" چپ ہو جاتے۔ منصف مزاج تو یہ جواب سُنکر خاموش ہو جاتے مگر جو ڈھیٹھ ہوتے وہ پیچھا نہ چھوڑتے۔

میرزا صاحب کے ایک دوست ہیبت خاں نام تھے، ان کے چہرے پر ہیبت کے کوئی خاص آثار تو نہ تھے مگر خط و خال سے پٹھان ضرور معلوم ہوتے تھے، لب و لہجہ بھی پٹھانوں والا تھا، بعض وقت خاص کر گالی دینے کے وقت ضرورت سے زیادہ "پٹھانیت" کا اظہار کرتے، بلکہ ان کی نسبت یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ ان کی "پٹھانیت" صرف گالی گلوج ہی میں ظاہر ہوتی تھی، یا اس کا خفیف سا ترشح ان کی لنگی کی بندش اور سر پر اس کے ایک طرف نمایاں جھکاؤ سے ہوتا تھا، گو میرزا صاحب کی طرح وہ اپنا سلسلہ شاہانِ کابل سے نہ ملاتے کیونکہ سرحد پر جانے کے لئے گورنمنٹ ہند سے پروانہ راہداری لینا ضروری ہوتا ہے مگر وہ اپنے آپ کو سرحد کے اس پار والے خوانین عظام میں میں سے ضرور شمار کرتے، بدن کے چونکہ اچھے مضبوط تھے اس لئے اُنھیں اپنی "شہزوری" کا بہت مغالطہ تھا، بات بات میں ہر ایک کو "ہڈیاں توڑ دینے" کی دھمکی دیجاتی، بر موقع وبے موقع "خو ہم پٹھان ہے" کا اعلان موچھوں پر تندی سے تاؤ دیکر کیا جاتا، اپنی "شہزوری" سے بڑھ چڑھکر انھیں زیادہ گھمنڈ اپنی بیوی پر حکومت کرنے کا تھا، اس لئے اُٹھتے بیٹھتے ان کی میرزا صاحب سے نوک جھوک رہتی، ان کا قول تھا کہ جب تک ہندوستانی اپنے گھر میں اپنی بیوی پر حکومت کرنا

نہ سیکھیں گے وہ اپنے ملک پر کبھی حکومت کرنے کے قابل نہیں ہو سکتے "گھر کی حکومت" ان کے نزدیک اس امر کے مرادف تھی کہ بیوی ایک مشین کی طرح کام کرے، میاں کی زبان سے حکم نکلا اور بیوی نے بلا چون و چرا تعمیل کی، ان کا اعتقاد تھا کہ عورت کو دل، دماغ، احساس، جذبات کسی سے واسطہ نہیں اس کی زندگی کا مشن صرف مرد کی خدمت ہے، انکو یقین تھا کہ ایشیا پر یورپ کا تسلط بہت جلد ختم ہو جائیگا کیونکہ یورپ کے مرد عورتوں کے غلام ہو رہے ہیں، ایک دن امریکہ کے کسی اخبار میں ایک کارٹون پر ان کی نظر پڑی، دیکھا کہ ایک عورت بڑے طمطراق سے جا رہی ہے، ہاتھ میں ایک زنجیر ہے جس کا ایک سرا ایک مرد کے گلے میں ہے جو کتے کی طرح اسکے پیچھے پیچھے آ رہا ہے، یہ دیکھکر بہت چراغ پا ہوئے، بہت بھنّائے، انگریزی، پشتو، فارسی اُردو کے جتنے لفظوں کا اطلاق "نامردی" اور بزدلی پر ہوتا ہے وہ یورپ اور امریکہ والوں پر ختم کر دئے، مگر پھر بھی غصہ ٹھنڈا نہ ہوا، کہنے لگے کہ اسی واسطے تو میں تہذیب مغربی کا جانی دشمن ہوں اس کے پرستار اپنا وقار کھو رہے ہیں، عورت کو ایسی آزادی دینا کیا معنی، پاؤں کی جوتی کو سر پر رکھنا بھی کوئی عقلمندی ہے، ان کی باتیں سُنکر لوگ ان کی بیوی کے حق میں دعائیں مانگتے اور اس کی "مظلومیت" پر اظہار افسوس کرتے، ہر وقت انھیں توقع رہتی کہ خانصاحب کے ظلم اور جبر و تعدی

سے تنگ آکر وہ "بے زبان" خودکشی کرلیگی، مگر حیرانی کی بات یہ ہے کہ ایک مدت تک ان کی یہ توقع پوری نہ ہوئی۔

خاں صاحب کے ایک دوست شیخ ستار علی کو بھی یہی زعم تھا، خانصاحب کی ہر بات میں ہاں سے ہاں ملاتے، ان کے دلائل کو سراہتے، ان کے افعال کی داد دیتے اور ان کی ہر بات کو آمنّا و صدقنا کہکر قبول کرتے، جو کچھ ان کی زبان سے سُنتے اُسے گرہ میں باندھ لیتے اور اس پر عمل کرنے کا تہیّہ کر لیتے، وہ خود خانصاحب کا سایہ تھے اور اُنکی رائے خانصاحب کی رائے کی صدائے بازگشت۔

وہ ان لوگوں میں سے تھے جنکی اپنی شخصیت صفر ہوتی ہے، جنھیں اپنی رائے کے اظہار کی جرأت یا لیاقت نہیں ہوتی اور جنھیں ہر وقت یہی حیرت ہوتی ہے کہ ان کی رائے دوسروں کی رائے سے کس قدر ملتی ہے، وہ اپنی دانائی کا معیار اسی مشابہت آراء کو قرار دیتے ہیں، اپنے قدموں پر کھڑا ہونے کی ان میں اہلیت نہیں ہوتی اس لئے وہ دوسروں کے سہارے کے محتاج رہتے ہیں اور جب یہ سہارا مل جائے تو خوب بڑھتے ہیں، ان کی مثال اس بیل کی سی ہے جو کسی تناور درخت کے گرد لپٹ کر اس کی چوٹی تک جا پہنچتی ہے اور خوب پھلتی پھولتی ہے۔

ایک ہی دفتر میں ملازم اور قریب قریب رہنے کی وجہ سے ان حضرات کو روزانہ ملاقات کا اتفاق

ہوتا، اکثر شام کو سیر کے لئے اکٹھے جاتے، ایک روز شہر کے ایک مشہور سنیما میں ایک نئی فلم آئی جس کا چرچا کئی روز سے ہو رہا تھا، ہر اخبار میں اس کا اشتہار نکلتا، شام کے وقت ہر روز شہر میں بینڈ اور ڈھول کے ساتھ اشتہار بٹتے، ہر ایک کو اس کے دیکھنے کا اشتیاق ہوا، خانصاحب سنیما کے بیحد شوقین تھے، ان کی اس شوقینی کا شیخ صاحب میں سرایت کرنا قدرتی امر تھا، باقی رہے مرزا جی سو وہ سنیما نہ جائیں تو اور کون جائے، صلاح پکی ہوگئی، تاریخ مقرر کی گئی اور اس روز کا نہایت بیقراری سے انتظار ہونے لگا، سب کے سب ایک دوسرے سے بڑھکر اپنی مستعدی کا اظہار کرتے، خطرے کی دوری جرأت کا باعث ہوا کرتی ہے، جب مقررہ دن آپہنچا تو تینوں کے خاصکر میرزا جی کے پیٹ میں چوہے دوڑنے لگے، وعدہ توڑنے کا بہانہ سوچتے مگر ایک دوسرے کی باتوں اور طعنوں سے گھبراتے، ایک طرف دوستوں میں اپنا رعب برقرار رکھنے کا خیال، دوسری طرف "ہوم گورنمنٹ" کی اجازت کے بغیر ایسے فعل کے ارتکاب کا خیال، عجب مصیبت میں جان تھی، ممکن ہے کہ میرزا جی بچ نکلتے مگر خانصاحب نے سب راستے روک دئے چونکہ میرزا صاحب کے ہاں ہر ایک ڈیپارٹمنٹ کا انتظام خاصکر فنانس کا "ہوم گورنمنٹ" کے سپرد تھا اور اُن کے سپرد از راہ کرم محض روپیہ کمانے کی خدمت تھی لہذا ماہواری بجٹ میں میرزا صاحب کے مشاغل تفریحی کی مد کا نظر آنا ناممکن تھا، یہ علیحدہ بات ہے کہ "پارٹی کے چندے"۔ "کسی غریب الوطن کے گور و کفن" یا "کسی یتیم کی امداد" کے بہانہ سے کچھ نہ کچھ وصول کرلیا کرتے، اس ماہ میں چونکہ دو چندے وہ پہلے دے چکے تھے لہذا "ہوم گورنمنٹ" سے اور روپیہ وصول ہونا ناممکن تھا، اس لئے انکی جان بہت مصیبت میں تھی، نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن" خانصاحب ایک ہی کائیاں تھے اُنھوں نے حقیقت کو بھانپ لیا اور وعدہ کیا کہ انھیں اپنے پلّے سے ایک کوڑی بھی خرچ نہیں کرنی پڑیگی، باقی رہا اجازت کا سوال، سو شہر میں جابجا مولود عرس اور نعت خوانی کی مجلسیں ہوا کرتی ہیں، چونکہ عورتوں کا میلان مذہب کی طرف زیادہ ہوا کرتا ہے لہذا میرزا صاحب یہ حربہ حیرت انگیز کامیابی کے ساتھ کئی دفعہ استعمال میں لا چکے تھے، جونہی یہ بین بجاتے کالا کیسا ہی پھنکار رہا ہوتا فوراً رام ہوجاتا، غرضیکہ تینوں گئے، ان کا خیال تھا کہ تماشا بارہ بجے تک ختم ہو جائیگا مگر انکی بدقسمتی سے روشنی تین دفعہ بند ہوگئی جس سے ایک بجے کا عمل ہوگیا، عجلت میں کھانا بھی نہیں کھایا تھا، اس خوشی میں کہ تماشا دوسروں کے پیسہ سے دیکھا میرزا صاحب دونوں کو دلاسا دیتے گئے تھے کہ واپسی پر کھانا کھلائینگے اور اس مرغ پلاؤ کی طرف بڑے پر اسرار طریقہ سے اشارہ کیا جس کی تیاری

میں انکی " نصف بہتر " کو کمال حاصل تھا اور جس کا
ذکر وہ ہزار ہا مرتبہ کر چکے تھے مگر اس کل کی نوبت
کبھی نہ آئی تھی جبکہ اس کے پیش کئے جانے کا
وعدہ ہوتا، سنیما سے نکلے تو میرزا جی کے ہوش پرا
غائب، دیر سے گھر جانے کا خوف، دوستوں کو
کھانا کھلانے کی فکر، خیال ہوا کہ ممکن ہے آج بھی
حسب معمول " اجی تکلف نہ کیجئے " کہکر عزت رکھ لیں،
مگر وہ تو منکر نکیر کی طرح پیچھے ہو لئے، اب حیران تھے
کہ کیا کریں کیونکہ جب کبھی یہ مرغ پلاؤ تیار ہوا کرتا
تو نصف سے زیادہ ایک پڑوسی نہ توبہ " پڑوسن " کے
یاں جنھیں یہ نہایت مرغوب تھا اور جنکی خوشنودی
خاص طور پر مطلوب تھی نہایت باقاعدگی سے بھجوایا
جاتا اور میرزا صاحب کو صرف کھرچن پر اکتفا کرنا پڑتا
اب انھیں فکر ہوئی کہ کسی طرح ان سے چھٹکارا
حاصل کریں، چنانچہ یوں فرمانے لگے۔
مرزا صاحب۔ " رات زیادہ آگئی "۔
خانصاحب۔ " ہاں، مگر کیا مضایقہ ہے "
مرزا صاحب۔ " کچھ نہیں، یونہی کہہ رہا تھا "
چند قدم آگے چلکر مرزا جی پھر بولے۔ " کھانا
ٹھنڈا ہو گیا ہو گا "
شیخ صاحب۔ " کچھ فکر نہیں، گرم کرا لینگے "
میرزا صاحب۔ اس وقت آگ کہاں ہوگی "
خانصاحب۔ " جلا لیں گے "
میرزا صاحب۔ " ماما تو گھر چلی گئی ہو گی "
شیخ صاحب۔ " اجی بھاوج صاحبہ ذرا تکلیف کرینگی "

مرزا جی کے کاٹو تو لہو نہیں بدن میں، ماما کی عدم موجودگی
میں جبکہ بیگم صاحبہ کی طبیعت اکثر علیل ہو جایا کرتی
میرزا صاحب کو اکثر ایسی خدمت انجام دینی پڑتی
تھی، سمجھے کہ آج بھی خیریت نہیں، خیال تھا کہ
" عاقل را اشارہ کافی است " یہ بلا سر سے ٹل جائیگی
مگر وہ کمبخت تو برسات کی مکھی کی طرح چمٹے تھے،
کبھی ان پر لاحول بھیجتے، کبھی اپنے بچاؤ کے لئے
وظیفہ پڑھتے، قدم من من کے بھاری ہو رہے
تھے، جس طرح بھیڑ مقتل کی طرف، بچہ اسکول
کی طرف یا ملزم پھانسی کی طرف جاتا ہے وہ اپنے
گھر کی طرف جا رہے تھے، آخر وہاں جا پہنچے،
دروازہ بخیل کی مٹھی کی طرح بند تھا، پہلے آہستہ
سے دستک دی، ذرا کھانسے، ڈرتے ڈرتے ماما
کا نام پکارا، جواب ندارد، دوستوں سے مخاطب
ہوکر نہایت بیکسی سے فرمانے لگے " معلوم ہوتا ہے
سو گئیں "۔ میں نے کہا نہ تھا رات زیادہ آگئی ہے
ان الفاظ میں ان بیدردوں سے اشارتاً التجا کی گئی
تھی کہ وہ دفان ہو جائیں مگر وہ عقل کے اندھے یا
مطلب کے پکے کچھ نہ سمجھے اور اگر سمجھے بھی تو انھیں دق
کرنے کی خاطر ڈٹے رہے، شیخ جی بولے کہ " بھائی
میرزا صاحب آنتیں تو قل ہو اللہ پڑھ رہی ہیں
اب ٹانگوں نے بھی وظیفہ شروع کر دیا، جلدی آؤ "
مجبوراً اپنی تمام طاقتوں کو جمع کرکے انھوں نے
کنڈی کھٹکھٹائی، ایک بار، دو بار، سہ بار، پہلے
آہستہ، پھر ذرا زور سے، پھر زیادہ زور سے، جب

نہ ملا تو کچھ جرأت ہوئی لہذا کنڈی کھنکھٹانے کے ساتھ آواز بھی بلند کی، اس کو ش کو سُنکر پڑوس کی ایک کھڑکی سے کسی نے سر نکالا، میرزا جی کے دائیں بائیں دو اشخاص کو دیکھکر سمجھا کہ شاید زیر حراست ہیں فوراً دروازہ بند کرلیا، آخر آدھ گھنٹہ کی چیخ پکار کے بعد اندر سے یک لخت ایک چنگھاڑ سنائی دی، جسے سُنکر بیچارے میرزا جی کے ہوش پراں غائب ہوگئے۔ بدن میں رعشہ، خوف و بیکسی و ندامت کی مجسم تصویر، دوستوں سے کہنے لگے " میں نے نہیں کہا تھا کہ سو رہی ہونگی، کچی نیند جاگ اُٹھی ہیں"۔ شور رفتہ رفتہ قریب آتا گیا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی غضبناک بھینسا ڈکراتا ہوا چلا آرہا ہے، ڈیوڑھی کا اندروالا دروازہ اس زور سے کھلا کہ مکان کی بنیادیں ہل گئیں، اس کے بعد ایک لمبی چوڑی تقریر شروع ہوئی جس میں افتتاح کے طور پر میرزا صاحب کے تمام بزرگوں اور عزیزوں اور خاصکر عورتوں کو خاص خاص ناموں سے منسوب کیا گیا۔ پھر خاندان کی تاریخ شروع، کئی واقعات کو نہایت وضاحت سے بیان کیا گیا اور اُنکے اس تعلق پر جو ان کو آخری تاجدار خاندان مغلیہ سے تھا پوری روشنی ڈالی گئی، اس داستان کے چند واقعات کو بار بار دُہرایا گیا، ایک سرچ لائٹ تھی جو میرزا صاحب کے خاندانی اسرار کو منکشف کر رہی تھی، اس کے بعد اس فصاحت و بلاغت کا رُخ میرزا صاحب کی ذات کی طرف پھرا، انھیں انکی عیاشی، اوباشی، بدمعاشی بدقماشی اور نہ معلوم کس کس "آشی" پر اور اپنی معصومی بکیسی، بیچارگی، اور"کم زبانی" پر توجہ دلائی گئی۔ بعض دفعہ ہچکی یا حلق سے ذرا بھاری آواز نکال کر اپنی بکیسی و بیچارگی کا ثبوت دیا جاتا، سب سے سخت ضرب وہ تھی جو میرزا صاحب کی ہمت مردانہ یا "مردانگی" پر لگائی گئی، ان سے بہ غیض و غضب استفسار ہوا کہ جب اپنی گانے کے لئے چارہ میسّر نہیں تو گئوشالہ میں دان دینا کس برتے پر، رات کو گلیوں کی خاک چھاننا کیا معنی، یہ سنکر میرزا صاحب کی کچھ نہ پوچھئے، گھڑوں، مٹکوں نہیں بلکہ حوضوں پانی پڑ گیا، چاہتے تھے کہ زمین پھٹے اور سما جاؤں، جب گولنداز کو یقین ہوگیا کہ اس گولہ باری سے میرزا صاحب کا کچومر نکل گیا ہوگا تو توپ کا منہ ان کے دوستوں کی طرف پھیرا گیا لیکن ان کی شان میں پہلی ہی سُر نکلی تھی کہ وہ اس موسیقی کی تاب نہ لاکر وہاں سے چمپت ہوگئے۔

راستہ میں خانصاحب بولے " لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ کیسی زبان دراز عورت ہے، آج معلوم ہوا کہ میرزا صاحب اس قدر دبو ہیں، بہت سر چڑھا رکھا ہے، واللہ اگر میری بیوی ایک لفظ بھی منہ سے نکالے تو کھڑے کھڑے سر اُڑادوں، شیخ صاحب فرمانے لگے، نعوذ باللہ، میاں کی شان میں یہ گستاخی، مرد تو عورت کا تاج ہوتا ہے، میری بیوی اگر ذرا بھی زبان ہلائے تو زبان کھینچ لوں"، اسی طرح باتیں کرتے ہوئے دونوں آگے بڑھے، چونکہ خانصاحب کا مکان راستہ میں پہلے پڑتا تھا اس لئے اُنھوں نے شیخ صاحب کو کھانے کی دعوت دی جو

بہت ہی خوشی سے منظور کر لی گئی، مکان پر پہنچے تو دروازہ منتظر عاشق کی آنکھ کی طرح چوپٹ کھلا ملا، ڈیوڑھی میں قدم رکھا تو اندر سے دو کتے لپکے اور جھپٹ کر باہر نکل گئے، صحن میں پہنچکر خانصاحب نے اپنے آنے کی اطلاع آہستہ سے کھانس کر دی ہی تھی کہ میرزا صاحب کے گھر والا ڈراما شروع ہو گیا، مضمون وہی تھا، خانصاحب کی سنگدلی، سرد مہری، بیوفائی کج ادائی اور اپنی مظلومی، بیچارگی، دن کی تنہائی، شب کی جدائی، دن کو کڑھنا، رات کو جلنا وغیرہ وغیرہ۔ خانصاحب حیران، بت بنے ہوئے کھڑے ہیں، انکو کبھی وہم و گمان تک نہ ہوا تھا کہ جس چیز کو وہ سبزہ سے ڈھکی ہوئی خوبصورت چٹان سمجھے ہوئے تھے وہ آتش فشاں ہے جو کسی روز اس طرح پھٹ پڑے گا۔ گو اس پر کبھی کبھی سیاہ بادل چھا جایا کرتے تھے مگر ایک دو روز کے بعد وہ خود بخود غائب ہو جاتے، ایسا طوفان کبھی نہیں آیا تھا، ان کو کیا معلوم تھا کہ یہ مسکین بلی کسی روز اپنے پنجے اس طرح نکالیگی! ایک تو واقعہ بالکل نرالا، دوسرے یہ خیال کہ شیخ صاحب باہر کھڑے ہیں لہذا جرأت نہ ہوئی کہ کوئی لفظ زبان سے نکالیں چہ جائیکہ اس دھمکی کو پورا کریں جو راستہ میں دیتے آئے تھے، انکی چپ سے فریق مخالف کو اور جرأت ہوئی، ان کی خاموشی کو سرد مہری پر محمول کر لیا گیا، طوفان تیز ہو گیا، بادل کی کڑک کے ساتھ موسلا دھار بارش بھی شروع ہو گئی، آخر خانصاحب بولے " ہیں ہیں، بھئی آخر ماجرا کیا ہے، اس قدر خفگی کیا معنی، کچھ کہو تو سہی"۔ مگر ان کے الفاظ اس سیلاب کے سامنے خس و خاشاک کی حقیقت رکھتے تھے، باورچی خانہ میں گئے تو دیکھا کہ روٹیاں زمین پر بکھری ہوئی ہیں۔ سالن کی ہنڈیا چولھے میں اوندھی پڑی ہے، اتنے میں میر صاحب نے انتظار سے تنگ آکر دروازہ کھٹکھٹایا! انکی خوش اعتقادی ملاحظہ ہو کہ طوفان کا شور سنکر بھی ڈٹے رہے، خانصاحب بہت کھسیانے ہو کر باہر آئے، شیخ صاحب نے خیریت پوچھی، گو سب کچھ سن چکے تھے، حقیقت من وعن معلوم ہو چکی تھی مگر نہایت سادگی سے پوچھا کہ شور کیسا تھا، خانصاحب نے خیال کیا کہ پردہ رہ گیا، جان میں جان آئی بہت اطمینان سے جواب دیا " کیا عرض کروں، اندر جا کر عجب حالت دیکھی، شام کو اچھی بھلی تھیں میرے جانے کے بعد کھانا کھایا، کھانا حلق سے اترا ہی تھا کہ پیٹ میں درد شروع ہو گیا، بس اسی سے کراہ رہی ہیں، چارپائی پر لوٹن کبوتر ہو رہی ہیں اسی وجہ سے دروازہ بھی بند نہ کیا، آپنے ڈیوڑھی میں سے دو کتے نکلتے دیکھے تھے، انھوں نے کھانا خراب کر دیا، افسوس آپ کو بھی میرے ساتھ یہ زحمت اٹھانی پڑی" شیخ صاحب ایک ہی گرگے تھے، بولے " کسی حکیم کو لے آؤں؟" خانصاحب نے اپنا پیچھا چھڑانے کے لئے جواب دیا " نہیں کوئی ضرورت نہیں، میرے پاس ایک مجرب دوائی ہے ابھی جا کر دیتا ہوں، بہت جلد آرام ہو جائیگا، میں پھر آپ سے معافی چاہتا ہوں، شیخ صاحب رخصت

ہوئے تو ان کی جان میں جان آئی، اندر آئے اور
چپکے سے چارپائی پر لیٹ گئے مگر نیند ایسی اچاٹ
ہوئی کہ تمام رات کروٹیں لیتے گذر گئی، سوچتے کہ
آج مونچھ نیچی ہوگئی، بہت ذلت ہوئی مگر کیا کرتے
لہو کا گھونٹ پی کر خاموش ہو رہے، بہت غصہ آتا
تو اپنا ہاتھ یا سر چارپائی پر پٹک دیتے۔

اب ذرا شیخ صاحب کا حال سنئے، ان کا مکان
خانصاحب کے مکان کے قریب ہی تھا، جب وہاں
پہنچے تو دروازہ کھلا پایا، چونکہ دو واقعات دیکھ چکے تھے
لہذا بہت محتاط ہوگئے تھے، دبے پاؤں اندر گئے تو
بیوی کو صحن میں بغیر بستر چارپائی پر دراز پایا، بہت
آہستہ آہستہ قدم اٹھا کر آگے بڑھے گویا کسی افعی کا
سامنا ہے، ذرا قریب ہوئے، جھانک کر دیکھا تو معلوم
ہوا کہ منہ غیظ و غضب سے پھول کر کپا ہو رہا ہے، ہوش
و حواس سنبھالکر جرأت کی اور آہستہ سے بازو کو چھوا،
نہ معلوم ان کے اس چھونے میں کیا بجلی کا اثر تھا کہ
سونے والے کے جسم میں فوراً حرکت ہوئی اور منہ دوسری
جانب تھا، شیخ صاحب نے چارپائی کا طواف کیا اور
دوسری طرف جاکر پھر وہی حرکت کی، اب کی مرتبہ انکا
ہاتھ اس زور سے جھٹک دیا گیا کہ الامان، مگر معلوم
ہوتا ہے کہ اس سلوک سے ان کی پوری تسلی نہیں
ہوئی تھی، لہذا چارپائی کا ایک اور طواف کرکے
دوسری جانب پہنچے لیکن اس مرتبہ جو انھیں سبق
ملا وہ کبھی نہ بھولیں گے یعنی انکی انگلیوں نے جسم
کو بمشکل چھوا تھا کہ ایک لکد رسید ہوئی جس سے وہ
بالکل ٹھنڈے ہوگئے، سب گرما گرمی غائب، خیریت
اسی میں دیکھی کہ چارپائی سے ذرا ہٹ کر کھڑے ہوں
مگر حیران تھے کہ ماجرا کیا ہے؟ ویسے ہفتے عشرے
میں دو چار چوٹیں ہو جانا معمولی بات ہے مگر آج یہ
خلاف معمول "ٹانگوں کی ورزش" کیا معنی، مگر
چونکہ اپنے گرو گھنٹال خانصاحب کا حشر دیکھ چکے
تھے لہذا ڈھیل دینا مناسب سمجھا، باورچی خانہ میں
گئے تو ایک کھلیان تک نظر نہ آیا، مجبوراً صحن میں
آئے اور چارپائی پر "یاروں سے معاملہ واحد ہے"
کہکر لیٹ گئے، گو بھوک کی شدت اور بیوی کی
عدیم المثال "اطاعت و فرمانبرداری" سے کانٹوں
پر لوٹ رہے تھے مگر یہ تسلی تھی کہ دوستوں کے سامنے
عزت رہ گئی، مرزاجی اس واقعہ کے بعد چار روز
تک دفتر سے غیر حاضر رہے، معلوم ہوا کہ نصیب اعدا
طبیعت ناساز ہے، پانچویں روز نظر آئے تو یہ حالت
تھی کہ ایک بازو گلے میں لٹکا ہوا تھا، بائیں آنکھ
کے گرد سیاہ حلقہ تھا، بدن کے بعض حصوں سے
اگر کسی کا ہاتھ چھو بھی جاتا تو کراہ اٹھتے، ایک صاحب
نے جو راز سے واقف نہ تھے مزاج پرسی کی تو فرمایا
کہ "غسل خانہ میں پھسل گیا تھا، بہت بیڈھب
گرا، جس سے بڑی طرح چوٹیں آئیں" خانصاحب
کی شیخ صاحب سے چند روز تک ملاقات نہ ہوئی،
جب ایک روز ملے تو آنکھیں نیچی تھیں، شیخ صاحب نے مسکرا کر بیگم
کی طبیعت کا حال پوچھا تو جواب دیا "الحمدللہ اب اچھی ہیں" گو
دوستوں میں شیخ صاحب سرخرو تھے مگر دل میں منفعل تھے کہ کیا گذری۔

خاص،

مارواڑ کا ناجر (نامرد)

مارواڑ کا درزي

مارواڑ کا تهوري خاندان

مارواڑي ديشي مسلمان

مير لوگ

[جنکے نام سے اجمیر کا ضلع میرواڑا مشہور ھوا]

مارواڑ کي اونٹ گاڑي

باغِ نو

[جناب پنڈت انند جیت صاحب شیدا]
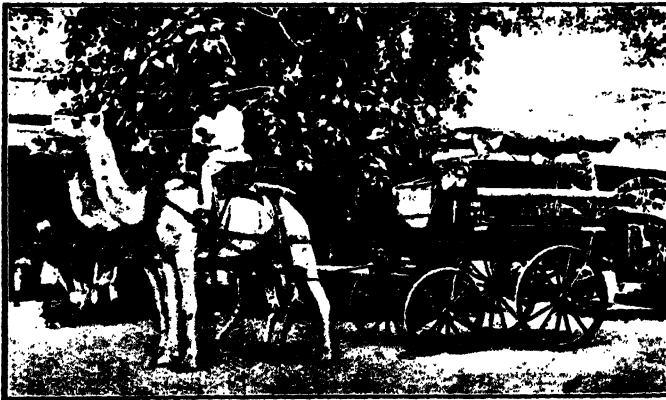
کہتا ہے باغباں تو اپنا جسے گلستاں میری نظر میں ہے وہ اک گوشۂ بیاباں
بادِ نفاق تیرے گلشن میں چل رہی ہے ہر برگ ہے پریشاں ہر گل ہے چاک داماں
مانا کہ رشکِ جنت پھولوں کا یہ وطن تھا دورِ خزاں سے لیکن اب ہو رہا ہے ویراں

برباد ہو رہا ہے پامال ہو رہا ہے
اُجڑا ہوا پڑا ہے بے حال ہو رہا ہے

آ، پھر اسی زمیں پر اک باغِ نو لگائیں اُجڑے ہوئے چمن کو فردوس کر دکھائیں
ارمان و آرزو کے پودے لگائیں اس میں جن میں وفا کی بُو ہو وہ پھول پھر کھلائیں
الفت یگانگت کے باغوں سے لا کے قلمیں دستِ خلوص سے ہم اُن پودوں پہ چڑھائیں
سیراب اُنکو جسدم کرنے کی ہو ضرورت حبِ وطن کی گنگا مل کے ہم بہائیں
لیکن تو اپنے دل میں یہ بھی خیال رکھنا بیلیں جو پھوٹ کی ہیں ہرگز نہ اُگنے پائیں
پھر دیکھنا کھلیں گے کیا کیا دلوں کے غنچے نقشہ گلِ تمنا اک اور ہی دکھائیں
پھرتی ہیں بلبلیں جو بچھڑی ہوئی پریشاں پھر آئیں اس چمن میں خوش ہو کے چہچہائیں
سب میکشانِ الفت صحنِ چمن میں آکر ہو ہو کے مست نغمے حبِ وطن کے گائیں
"ہندوستاں ہمارا ہندوستاں ہمارا" چاروں طرف فضائیں گونجیں یہی صدائیں

ہم خدمتِ وطن میں تن من نثار کر دیں
یہ نخلِ آرزو بھی پھولیں پھلیں ثمر دیں

خاص

شاہکارِ ادب

[جناب مولانا شاہ سید حبیب احمد صاحب "مولوی فاضل" مولوی شعبۂ تاریخ
یونیورسٹی الہ آباد]

یہ ایک نہایت سچا مقولہ ہے کہ "وہ قوم بدنصیب ہے جو اپنے بزرگوں کے اُن کارناموں کو جو یاد رکھنے کے قابل ہیں بھُلادے یا اُن کو نہ جانے" بزرگوں کے قابل یادگار کاموں کو یاد رکھنا اچھا اور بُرا دونوں طرح کے پھل دیتا ہے، اگر خود کچھ نہ ہوں اور نہ کچھ کریں، صرف بزرگوں اور اسلاف کے کارناموں پر شیخی ماریں تو استخوان جدفروش کے سوا کچھ نہیں۔

مگر ہم وہ کریں یا نہ کریں، یہ پچھلی بات ہے، پہلے ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ وہ دلچسپ حالات اور پرفخر واقعات کہاں سے تلاش کرنا ہے ہماری تاریخیں اُس زمانہ کی لکھی ہوئی ہیں جس میں زمانہ نے تاریخ نویسی کے فن کو پوری طرح ترقی نہیں دی اس لئے ہمیں فی الجملہ اُن مصنفین و مولفین اور نامور اہل قلم کا شکریہ ادا کرنا چاہئے جنکی سعی و کوششوں سے طلسم سربستہ کی عقدہ کشائی ہورہی ہے اور جنکی جنبش قلم کی بدولت تمام اجزائے ترکیبی تحلیل ہوکر وقتاً فوقتاً یادگار سلف بنیں ؎

پھر جگر کھودنے لگا ناخن
سینہ جویائے زخم کاری ہے

یادش بخیر! فاضل عصر مولانا سید مقبول احمد صاحب صمدنی کی تالیف جدید یعنی علامہ میر عبدالجلیل کی لائف جس کے لئے آنکھیں فرش راہ تھیں پردہ خفا سے ظہور میں آئی۔

حضرت مولانائے موصوف ادب و انشا پردازی کا ایک غیر معمولی ذوق سلیم رکھتے ہیں، باوجود سرکاری ملازمت اور ہجوم افکار ان کا ذہن ہمیشہ جدید تراکیب کی تراش و خراش میں لگا رہتا ہے، آپ رائل ایشیاٹک سوسائٹی اور رائل سوسائٹی آف آرٹس مینو فکچرس اینڈ کامرس کے ممبر ہیں۔

ذوق علمی کی مناسبت سے مولانا کے ساتھ مستشرق عظیم ولیم آروین اور مسٹر بیوریج (جو انڈیا آفس، برٹش میوزیم، رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے بیش بہا علمی جواہرات کے خازن تھے اور جن کی بہت سی علمی کتابیں، نادر چیزیں، نگاہ کرم و دست حفظ کی رہین منت ہیں) ارتباط خاص رکھتے ہیں

بعض تحسین ناشناس، تذکرہ شخصی کے اندر، اخلاقی مذہبی، افادی، اقتصادی اور فلسفی مختلف الموضوع

عناصر کو مستشرقانہ کمالات سے بعید بتاتے ہیں، میرا
خیال ہے کہ اس قسم کی سرد مہریاں لٹریچر پر ایک بدنما
داغ ہونگی، آجکل سرمایہ دار وہی سمجھا جاتا ہے جو پچھلوں
کی جمع کردہ مواد میں تصرف بیجا یا بجا کر سکے، آپ
میں مادۂ اختراعی کی کمی نہیں، مواد موجود ہے، خیالات
کو پھیلاکر سمیٹئے اور لکھئے۔

نئے گروہ سے اسکی بھی اُمید محض خیال خام
ہے، کساد بازاری کا یہ عالم، سچ پوچھئے تو اس وقت
تک صحیح علمی مذاق کا پتہ نہیں، نہ پڑھنا لکھنا ضروریات
زندگی میں داخل، قومی لٹریچر سے بیگانگی ایک طرح
کی نمود سمجھی جاتی ہے، انگریزی کی غیر ضروری آمیزش
نے روزمرہ کا جس طرح خون کر رکھا ہے اُس پر ستم ظریفی یہ
ہے کہ کسی کو احساس نہیں۔ مغربی تمدن اور شائستگی
کے دلدادہ جہاں یورپ کی تقلید پر مٹے ہوئے ہیں،
کسی خاص مسئلہ میں اجتہاد سے نہیں چوکتے، میرا
منشا اس سے یہ ہے کہ باوجود تکلفات زندگی کے
اسراف کے ساتھ بھی قومی لٹریچر پر کچھ صرف کرنا
جرم ہی نہیں بلکہ گناہِ عظیم سمجھتے ہیں، جس کی
بازپرس ہوکر رہیگی، مجھے پورا اطمینان ہے کہ ایسے
افراد اپنی توقعات مشکل سے پورا کر سکیں گے۔

میں جیسا کہ اوپر کہہ آیا ہوں آجکل کے نئے
تعلیم یافتہ جماعت کے اندر خالص علمی مذاق بہیئت
مجموعی ابھی پیدا نہیں ہوا مصیبت کی بات یہ ہے
کہ انھوں نے اپنی زبان بگاڑ رکھی ہے، خوب یاد
آیا، ایک صاحب جو خاصے گریجویٹ ہیں اور
جن کو کہنا یہ منظور تھا کہ "بیوی کا انتقال ہوگیا"
مزاج پرسی پر نہایت سنجیدگی سے فرمانے لگے کہ
"میری وائف کا ڈتھ ہوگیا"
اُن سے ایک صاحب نے عرض کیا کہ حادثہ سے
اظہار خیال کے طریقہ پر افسوس ہے۔!!!

یہ نمونہ ہے اُس ٹکسالی زبان کا جو آجکل
ہماری تربیت گاہوں میں زوروں کے ساتھ
رائج ہے، اچھے اچھوں کو دیکھا گیا ہے کہ پورا
فقرہ اپنی مادری زبان کا بغیر اختلاط انگریزی
نہیں بول سکتے، ایک خاص طرح کا روزمرہ ایجاد
ہے جس میں آدھے سے زیادہ بے ضرورت انگریزی
کی بھرتی ہوتی ہے۔

گوروں کی بگڑی اُردو بیگانگی زبان کی وجہ سے
پھر بھی لائق درگزر ہے لیکن یہ نئی بات ہے کہ
اہل زبان اور گونگے!

میں سلسلہ سے الگ ہونا نہیں چاہتا اس لئے
زبان کے مسئلہ پر بھی کچھ عرض کر دینا چاہتا ہوں۔

ملک کی کسی تعلیم یافتہ جماعت نے کبھی اس پر
غور نہیں کیا کہ ہر چیز ایک نظام طبعی رکھتی ہے اور
اُردو زبان بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہے، زبان
کا مسئلہ کبھی اس حیثیت سے پیش نظر نہیں رہا اور
نہ منفرداً یا متفقاً کبھی یہ جاننے کی کوشش کی گئی
کہ لٹریچر کی فطری ضروریات کے لحاظ سے کون کون سے
کام مفید ہیں جن پر ترتیباً سب سے پہلے توجہ
ہونی چاہئے اور در اصل ترقی اُردو کے نظام

ترکیبی کا اقتضائے طبعی کیا ہے؟ -

پروفیسر "براون" آف کیمبرج جو مستشرقین یورپ میں ایک زبردست شخصیت رکھتے ہیں اور جن کو مشرقی لٹریچر سے خاص دلچسپی ہے، ترقی زبان کے بارے میں ممدوح کی رائے یہ ہے کہ ہمیں سب سے پہلے "صالح لٹریچر" کی اشاعت کرنی چاہئے اسی طرح ضخیم لغات کی ترتیب اور اُردو، فارسی، عربی کی لاکھوں جلدیں "لغات المبتدی" کی حیثیت سے مرتب کرنی چاہئے اور اس کثرت سے شائع کی جائیں کہ بچہ بچہ کے ہاتھوں میں ہوں -

میرا خیال ہے، پروفیسر براون کی یہ اسکیم نسبتہً اس قدر ضروری ہے کہ اگر اس کا ذکر نہ کیا جائے تو لٹریچر کی حق تلفی ہوتی، اُردو زبان کی لائق ذکر خصوصیات میں جنکی تفصیل کا یہ موقع نہیں، اس کا وسیع ذخیرۂ الفاظ، شستہ، رفتہ طرز بیان اور ادائے خیال کی بہتری جدت آمیز نزاکتیں ہیں، جنکی بنا پر آج بھی وہ زندہ زبانوں میں کسی سے پیچھے نہیں، ایسی لچکدار زبان کی شاعری جو جذباتِ انسانی کی برانگیختہ کرنے والی ہو اور جس میں خود نفس انسانی مخاطب صحیح ہو، آپ سمجھ سکتے ہیں کہ کیا پایہ رکھتی ہے، نثر کو اگر "ضروریات" زندگی میں رکھئے تو شاعری اپنی ادائے خاص اور مایہ الامتیاز حیثیت سے اُن تکلفات کا نام ہے جن سے کوئی شایستہ اور متمدن قوم قطع نظر نہیں کر سکتی لیکن آجکل کی کاروباری زندگی میں جب ہم کو مشرقی لٹریچر کی طرف توجہ کرنے کی بالکل فرصت نہیں تو اُس کا صرف ایک ہی طریقہ رہجاتا ہے کہ عربی فارسی لٹریچر کے بہترین اجزاء فلسفیانہ تنقید و تقریظ کے ساتھ نئی نسل کے سامنے پیش کئے جائیں اور اس طرح "زبان" کا وہ حصہ جو جاننے کے لائق ہے ہمیشہ کے لئے محفوظ رہجائے -

میں دوبارہ سلسلے سے ہٹنا نہیں چاہتا ورنہ ہندی کی ضرورت کو بھی جو نہ صرف شریک زبان ہے بلکہ اُردوے ادب میں کافی رسوخ رکھتی ہے وضاحت کے ساتھ بیان کرتا -

گو مجھے شاہراہ سے علٰحدہ ہو جانا پڑا تاہم ہمکو اس جذبہ کے لئے جہاں تک لٹریچر کی تحسین شناسانہ کا تعلق ہے معذرت کی ضرورت نہیں اور ہم بلاخوف تردید "مولانا" کے وسیع ذخیرہ معلومات کو دیکھتے ہوئے یہ عرض کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ "موصوف" یورپ کے محققین کی صف میں جگہ پانے کے مستحق ہیں بشرطیکہ آپ بھی اُنھیں "گھر کی مرغی ساگ کے برابر" نہ سمجھئے -

مجھے ممدوح کی تصنیفات میں سے "حیاتِ جلیل" کو نظرانداز نہیں کرنا چاہئے جو معیار تصنیف کے لحاظ سے متاخرین ادب میں کسی دوسرے درجہ پر نہیں -

یہ کتاب دو حصوں میں ہے -

پہلا - حالات علامہ میر عبدالجلیل رح

دوسرا - میر میرور کے کلام و تصانیف کا مبسوط تذکرہ ہے اور اُن پر نقد و تبصرہ -

ضمناً ہر دو حصص میں حواشی کے ذریعہ بہت سی

مورخانہ تلاش و تدقیق کی گئی ہے، جسکے لئے مصنف کو نہایت زحمتِ تلاش اور سیکڑوں قدیم و نایاب تاریخوں کے ہزاروں ورق اُلٹنے پڑے ہونگے۔

غرضکہ معلومات کا جو ذخیرہ جمع کیا گیا ہے میرے خیال میں بہت سے دقیق مطالب کی رہنمائی کے لئے ہمکو غیروں سے تقریبًا بے نیاز کر دیا ہے۔

ایک دو سو تہتر اور دوسری دو سو نو صفحے کی کتاب ہے، دونوں حصے مجلد ہیں ٹائٹل پیج نہایت خوبصورت، طباعت و کتابت دیدہ زیب۔

مجلۂ علمی کا آغاز حمد و نعت کے ساتھ کیا گیا ہے، اس میں شک نہیں جہاں مولانا میں ادبی مذاق کا ایک بڑا حصہ موجود ہے، منظوم حمد و نعت پڑھنے سے مذاق شاعری کے متعلق بھی کہنا پڑتا ہے کہ وہ سچے جذبات میں ڈوبا ہوا شاعر خالص اہلِ زبان ہے، جس کے شستہ رُفتہ کلام کی برجستگی اپنا مرتبہ آپ بتائیگی۔

کہتا ہے :۔

یا اَزَلیَّ الْقِیَامِ یَا اَبَدِیَّ الْبَقَا
اَنْتَ اَجَلُّ الْغَضَبِ اَنْتَ جَمِیْلُ الرِّضَا

"عشق ترا جانفزا شوق ترا دل رُبا
ذکر ترا قوتِ روح نام ترا غم زُدا"

"راہ تقرب میں تھا، نفس شقی اژدہا
جادۂ تسلیم کو، تُو نے بنایا عصا"

"ہوش کا جب کارواں تیری طلب میں چلا
نعرۂ ہُو بن گیا، شوق کو بانگِ درا"

"مکتب عرفاں ترا درس گہ انتہا
شرح حقیقت تیری، درس حروف ہجا"

"راہ میں تیری، جو ہوں صدق و یقیں گامزن
دیدۂ حورا بنے حسن میں ہر نقش پا"

اسی طرح مسلسل لکھتا ہوا چلا جاتا ہے، آگے کہتا ہے

"تیرا ازل ہے ابد، تیرا ابد ہے ازل
کس کو کہوں ابتدا کس کو کہوں انتہا"

آخر میں۔

"نیشتر غم فضول فصد رگ جاں عبث
روح کا دمساز ہے عشق کا ماخولیا"

"بہرِ رسول جلیل کر یہ دعا مُستجاب
سہل ہو مقبول پر سختی روز جزا"

نعت شریف میں گہرباری ملاحظہ فرمائیے۔

"یا شرف الاتقیا، یا حضر الاولیا
قلبک عین الجلا نفسک اصل الصفا"

"انت جمیل الشیم انت بری الخطا
انت شفیع الامم انت نبی الوریٰ"

"جانتے تھے انبیا اپنا تجھے مقتدا
مسجد اقصیٰ میں کی سب نے تری اقتدا"

"ناسخ ہر سہ کتاب ماحی کفر و شقاق
برزخ کبریٰ لقب رحمت حق مصطفیٰ"

آخر حصہ میں

"تجھ پہ درود و صلوٰۃ آل پہ تیری سلام
ہے یہ وظیفہ مدام خاطمی مقبول کا"

"ناوک غم کا ترے، زخم نہ ہو مندمل
آنکھ رہے خونچکاں دل رہے درد آشنا"

"فردِ عمل ہے سیاہ، پاس نہیں زاد آہ
تیری شفاعت کا ہے، اُسکو فقط آسرا"

مختصر یہ ہے کہ علمی قلمرو میں یہ ایک تاریخی کتاب ہے، جسے خاص امتیازی فوقیت حاصل ہے، تاہم صاحب کتاب نے جو موضوع سخن اختیار کیا ہے بہتر ہوتا کہ صرف "حیات جلیل" پر سرسری نظر ہوکر رہ جاتی اور مواد ترکیبی کے لئے دوسری گنجائش نکال جاتی۔

بہرحال ہماری توقعات ابھی صرف اس کتاب سے پوری نہیں ہوسکتیں، اُمید ہے کہ مبرور کی سلسلہ تصنیف استادانہ حیثیت سے آئندہ بھی ملک کو دماغی اور ادبی سبق دیتی رہیگی اور گذشتہ نقصانات کی تلافی مافات کر دیجائیگی ؎

ساقی مے دے کہ اہل مجلس
پانی پانی پکارتے ہیں

لیکن مولانا سے ہمکو اس قسم کی شکایت نہیں، یہ خود بلا بار تہدید و فرمایش جو کچھ کرتے رہتے ہیں وہ ہماری توقعات اور استحقاق سے کہیں زیادہ ہے۔

غلام علی آزاد کی سوانح کے متعلق جو وعدہ کیا گیا ہے، ہمکو اس سے نااُمید نہیں ہونا چاہئے۔

آخر میں مجھے یہاں کہدینا ہے کہ "میں سرکست حالتوں کا موازنہ اور تنقیدی عناصر کو ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرانا نہیں چاہتا، ناظرین خود اس کا فیصلہ فرمالیں کہ فاضل مصنف کی خدمات کہاں تک قابل داد ہیں۔

تو و طوبیٰ، و ما و قامتِ دوست
فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

میں جیسا کہ اوپر لکھ آیا ہوں کہ ہندی بھاشا کی ضرورت کو اس سے علٰحدہ نہیں سمجھتا صرف خلط بحث ہونے کی وجہ سے اُس کا اعادہ نہ کرسکا۔

آئندہ اشاعت میں ڈھائی تین سو برس پیشتر کے مسلمان اہل علم و ادب کی ہندی شاعری کے متعلق مفصل عرض کرونگا اور "علامہ میر عبدالجلیل بلگرامی" کی ہندی بھاشہ اور منظومات کے نمونے پیش کئے جائینگے۔ جو آج تک "میر جلیل" کے نام سے ہندی شعرا کے تذکروں میں ممتاز جگہ رکھتے ہیں۔

خاص

اپنی اپنی سمجھ

دوست۔ "بڑی بی، مبارک باد، سُنا تم نے پھر شادی کرلی اب تو کپڑا دھونا تم نے چھوڑ ہی دیا ہوگا"

بڑھی۔ "ابھی نہیں! اسی لئے تو شادی کی تھی، گدھا مر چکا تھا، لادنے کے لئے دوسرا تھا ہی نہیں"

پروفیسر۔ "اے کوئی ہے، جلد آتشدان ہٹاؤ، ورنہ میں کباب ہوا چاہتا ہوں"

نوکر۔ "حضور! کرسی ذرا الگ کر لیجئے"

پروفیسر۔ "شاباش، مجکو یہ سوجھی بھی نہ تھی"

سری کرشن

[منشی سکھدیو پرشاد سنہا بسمل الہ آبادی]

"کرشن گنج الہ آباد میں سری کرشن کی شبیہ جس کی کاپی اسی نمبر میں ہدیۂ ناظرین ہو رہی ہے، اُسی سے متاثر ہو کر کرشن گنج میں کرشن جنم اشٹمی کو ایک جلسہ میں، جو کہ بصدارت کنور مہراج سنگھ صاحب بہادر کمشنر الہ آباد منعقد ہوا تھا، حسب فرمائش خاص حضرت بسمل نے مسدس ذیل تصنیف فرما کر اپنی جادو بیانی سے حاضرین کو محظوظ کیا۔ اب یہ پہلا موقع ہے کہ مسدس مذکور "چاند" میں شائع ہو رہا ہے۔"

یہ وہ شب ہے جو عبادت ہے زمانے کے لئے　　یہ وہ شب ہے جو نصیحت ہے زمانے کے لئے
یہ وہ شب ہے جو غنیمت ہے زمانے کے لئے　　یہ وہ شب ہے جو مسرت ہے زمانے کے لئے
آج کی رات سیہ بخت ہمارا چمکا
آج کی رات اُمیدوں کا ستارا چمکا

مژدۂ عیش و خوشی ساتھ لگا لائی تھی　　رات بھادوں کی اندھیری تھی گھٹا چھائی تھی
کنس کی موت اسی پردے میں چھپی آئی تھی　　کھلنے والی کلی دل کی نہیں مرجھائی تھی
لیا متھرا میں جنم آکے رہا گوکل میں
پاؤں کے رکھتے ہی امرت ملا جمنا جل میں

وہ زمانے میں نئے رُوپ سے آنے والا　　وہ کنھیا وہ مرے دل کا لبھانے والا
وہ بڑے پریم سے بنسی کا بجانے والا　　وہ بھجن نغمۂ الہام بتانے والا
جلوۂ نورِ ازل عالم تنویر میں تھا
یعنی جو کچھ بھی تھا بس خاک کی تعمیر میں تھا

وہ قطرہ ہی نہیں جس کو نہیں حسرت اسکی   دل وہ کیا دل ہے نہیں جس کو محبت اسکی
کھل گئی دیدۂ بینا پہ حقیقت اُسکی   ایک ایک شے میں نظر آتی ہے صورت اُسکی

شاہدِ معنیٔ اسرار ظہورِ قدرت
سب پہ روشن تھا کہ وہ خاص تھا نورِ قدرت

نند کے لال جسودا کے دُلارے موہن   سب کے بگڑے ہوئے سب کام سنوارے موہن
اس طرف بھی نگہِ لطف ہو پیارے موہن   کچھ ہماری بھی سُنو آ کے ہمارے موہن

ہو گئی زیر و زبر دیکھ لو دُنیا دل کی
دل ہی دل میں رہی جاتی ہے تمنا دل کی

دب گئے مٹ گئے مغرور اُبھرنے والے   نام سُن سُن کے ترا ڈرتے تھے ڈرنے والے
حسرتِ جور میں مرتے رہے مرنے والے   ظلم کو بھول گئے ظلم کے کرنے والے

اُٹھ گئی چشمِ غضب کنس کی ہستی نہ رہی
خود پرستی نہ رہی قہر پرستی نہ رہی

گیان کی راہ زمانے کو دکھائی تُو نے   پریم کیا چیز ہے یہ بات بتائی تُو نے
غم بھی تجھ کو ملے تکلیف بھی پائی تو نے   دور دُکھ ہو گیا مُرلی جو بجائی تو نے

اک نئی طرز نئی آن سے بولی بنسی
تٹ پہ جمنا کے عجب شان سے بولی بنسی

کس قیامت کا بھرا سوز ترے ساز میں ہے   رنگِ الفت بھی نہاں خوبیٔ انداز میں ہے
یہ بڑے جوش میں ہے اور بڑے ناز میں ہے   گویا جادو اسی جادو بھری آواز میں ہے

راگ کے وقت کوئی دھن مرلی کی نئی لے میں ہے مست
دیکھتا ہوں جسے اچھی طرح وہ لے میں ہے مست

اپنی قوت کو بڑے جوش میں لانے والا   اُنگلیوں پر وہ گوبردھن کا نچانے والا
وہ سُداما کی غریبی کا مٹانے والا   کام سنکٹ میں ہر اک شخص کے آنے والا

اب بھی آفاق کے لب پر ہے فسانہ تیرا
یاد ہے یاد زمانے کو زمانہ تیرا

تیرے ہوتے نہ کوئی درپئے آزار رہا   تیرے ہوتے نہ جفا کار جفا کار رہا

بیکسوں کے لئے ہر حال میں غم خوار رہا دھرم کے واسطے ارجن کا مددگار رہا
کوروؤں کا وہ غرور اور نشاں تک نہ بچا
رن میں سب قتل ہوئے ایک جواں تک نہ بچا

نہ ہوا ہے نہ کوئی ہوگا ترا ثانی بھی ایسا یوگی بھی کہیں ایسا کہیں گیانی بھی
دان کو سُن کے چھپے شرم سے سب دانی بھی مٹ گئی دم سے ترے شانِ ستم رانی بھی
غور سے دیکھیں ذرا لوگ تماشا کیا ہے
تُو نے گیتا میں بتایا ہے کہ دُنیا کیا ہے

کلکِ قدرت سے ہے انسان کی تقدیر بنی خاک کے ذرّوں سے ہے خاک کی تصویر بنی
قابلِ دید ہر اک شکل کی تحریر بنی رشتۂ تارِ نفس کی نئی زنجیر بنی
آگ ہے خاک ہے پانی ہے ہوا شامل ہے
چار عنصر نہ ہوں تو زیست بہت مشکل ہے

یہ سمجھتے نہیں کم عقل اُبھرنے والے کہ بگڑ جائیں گے اک روز سنورنے والے
کام کرنے کے جو ہوں کرلیں وہ کرنے والے جینے والے نہیں آخر کو ہیں مرنے والے
کیوں مٹے جاتے ہیں دل اپنا لگانے کے لئے
آئے ہیں دہر میں سب دہر سے جانے کے لئے

زندگی کیا ہے کھُلی اس کی حقیقت کیسی موت کیا چیز ہے کی تُو نے نصیحت کیسی
دیش کے واسطے بے لاگ تھی اُلفت کیسی تیرے ہی دم سے ہوئی دھرم کی عزت کیسی
دھرم کا آج کہیں ذکر نہیں نام نہیں
کیوں نہ اندھیر ہو موجود یہاں شیام نہیں

آجا آجا ادھر اے نند دُلارے آجا پھر وہ بنسی لئے جمنا کے کنارے آجا
پردۂ غیب سے ہو جائیں اشارے آجا اب نہیں تاب غمِ ہجر کی پیارے آجا
آ کنھیا کہ ترے واسطے ہم بسمل ہیں
کہنے سننے کے لئے دل ہے مگر بیدل ہیں

مارواڑ

[کنور جگدیش سنگھ جی گہلوت ایم۔ آر۔ اے۔ ایس]

راجپوتانہ کے تقریباً ہر ریاست کے باشندے مارواڑی کہلاتے ہیں، اس کی وجہ خاص تو یہ ہے کہ ریاستوں کے لوگ خواہ جودھپور، بیکانیر، جیسلمیر، لونہ بی یا کسی اور ہی ریاست کے کیوں نہ ہوں پگڑی باندھے ہوئے نظر آتے ہیں، بہت سے لوگ تو مارواڑی لفظ کے معنی سے بالکل ناواقف ہیں اور اُنھوں نے غلط فہمی سے مارواڑی کا مطلب مکار، دھوکہ باز، لُچے اور بدمعاش تک کر ڈالا ہے، ایسے شخصوں میں مسٹر گنیش دھر مسمّی ایک ذی لیاقت صاحب نے اپنی اسکول کی ڈکشنری میں اس لفظ کے ایسے بُرے معنی بتائے ہیں کہ کیا کہنا، اگرچہ مارواڑی لفظ سے اُس ریگستانی ملک و ریاستوں کی طرف اشارہ ہے جس کا کہ نام نقشہ ہندوستان پر جودھپور کے نام سے مشہور ہے، لیکن اگر حقیقت سے جانچ کی جاوے تو معلوم ہوگا کہ راجپوتانہ کا تمام ملک مارواڑ ہے۔ کرنیل ٹاڈ کی رائے کے مطابق زمانہ قدیم میں دریائے ستلج سے لیکر سمندر تک کا سارا حصہ مارواڑ کے نام سے مشہور تھا۔ اور یہ معنی دُرست بھی معلوم ہوتے ہیں، کیونکہ مارواڑ کے لفظی معنی ہیں "اوسر یا ریگستانی زمین" راجپوتانہ اصلیت میں ایسا ہی ملک ہے، لہذا یہاں کے باشندوں کو زیادہ تر مارواڑی کے نام سے پکارتے ہیں، یہ کہنا کہ اس ملک کے کُل باشندے چالاک اور بدمعاش ہوتے ہیں ایک طرح کی جہالت و گستاخی ہے کیونکہ اس قسم کے نقص زیادہ تر دوسرے ممالک میں بھی پائے جاتے ہیں، مارواڑی لوگ چالاک نہیں بلکہ ہوشیار ہوتے ہیں، بدمعاش کے بدلے عالم و بہادر ہوتے ہیں، مکار نہیں بلکہ محنتی و جفاکش ہوتے ہیں، تواریخ ان سب باتوں کی گواہ ہے، کون ایسا ہے جو کہہ سکتا ہے کہ مہارانا پرتاب، بھیم، گورا بادل، جیمل فتہ، ایسے شور بیر و بہادر، پدموانی، مہرا بائی ایسی پاکدامن عورتیں، پرتھوی راج و درگاداس ایسے جنگجو و جوانمرد مارواڑی نہیں تو پھر کیا تھے، یہانتک کہ شاہنشاہ سیواجی بھی ایک مارواڑی خاندان میں پیدا ہوا تھا، یہ مارواڑ ہندوستان کے اندر دیسی ریاستوں کا ایک خاص مرکز ہے، جہانپر کہ اگر اب بھی غور کی نگاہ کی جاوے تو پُرانے اُصولوں و فرائض منصبی کے نشانات اور راستبازی و جوانمردی کے ثبوت کی اب بھی کہیں کہیں جھلک دکھائی دیگی۔

اس لئے یہ صوبہ بہت عزت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے اور اکثر باہر کی سلطنتوں نے اپنی بنیاد پائدار کرنے کے لئے اس کے سامنے دستِ سوال پھیلایا تھا، یہ وہی ملک اور اُس کی وہی سرزمین ہے کہ جس کا ذکر مسٹر ٹاڈ اپنی مشہور تصنیف کردہ تواریخ کے اندر اس طرح فخریہ کلام میں کرتے ہیں "راجستان (مارواڑ) میں کوئی چھوٹی سی بھی ریاست ایسی نہیں ہے کہ جس میں یونان کے تھرماپولی ایسی لڑائی نہ ہوئی ہو اور شاید ہی کوئی قصبہ ایسا ملے جہاں کوئی لیونڈاس ایسا بہادر نہ ہوا ہو" کسی زمانہ میں یہ صوبہ ہندوستان کی تہذیب و شان میں اپنا ثانی نہ رکھتا تھا، دوسرے ممالک جبکہ آزادگی، سیاست وسوراج کا نام بھی نہیں جانتے تھے اور جبکہ تعلیم یافتوں کے بھی گوش ان باتوں سے آشنا نہ تھے اُس وقت میں مارواڑ کے جوانمرد و بہادر مہارانا پرتاب و درگا داس وغیرہ نے سلطنت کی ہستی و راحت پر لات مار کر جنگل میں آزادگانہ زندگانی بسر کرنا پسند کیا تھا اور جس وقت کہ راجپوت کو اکٹھا کرنے کی تدبیر کسی کو سوجھی بھی نہ تھی، میواڑ کے مہارانا نے بھیلوں کو اپنا سمجھکر اکبر ایسے شاہنشاہ کو میدانِ جنگ میں نیچا دکھایا اور اس کی ساری شان کرکری کردی، بادشاہ کو بھی ان کا لوہا ماننا پڑا اور جس وقت کہ جمہوری سلطنت و رعایا کی حکومت کا خیال بھی دنیا والوں کے دماغ میں نہ گذرا تھا اس وقت اس ملک کے ریاست اودے پور وغیرہ میں مہارانا کوئی قانون میں تبدیلی یا محصول کی زیادتی بغیر پبلک و وزیروں کی راے کے نہیں کرتے تھے اور اگر کسی کو اعلیٰ افسری پر معمور کرنا ہوتا تب بھی راے لے لیا کرتے تھے، یہانتک کہ سردار اپنی رعایا کی بہبودی و بہتری کے لئے اکثر راجا کے خلاف کھڑے ہو جاتے تھے اور اُن کو راہ راست پر لانے کی کوشش کیا کرتے تھے، ایسی مثالیں تواریخ میں بہت پائی جاتی ہیں۔ مہارانا امرسنگھ کو اودے پور سے جنگ کرنے کا ارادہ نہ تھا لیکن رعایا کی مجبوری سے اُن کو غنیم کا مقابلہ کرنے پر آمادہ ہونا پڑا۔ اور راؤ مالدیو راٹھور کے تین لڑکے ہوتے ہوئے بھی رعایا نے سب سے چھوٹے لڑکے مہاراج چندرسین کو تخت کا وارث قرار دیا، وجہ اسکی یہ تھی کہ چندرسین ایک آزاد خیال کا آدمی تھا، اس قسم کی مثالیں، رعایا کی فراخی خیالات، پرستش آزادی ذرا دنیا کے صفحۂ ہستی پر ملنا مشکل نظر آتا ہے، اس حال کے مطالعہ کرنے سے ناظرین کی سمجھ میں آگیا ہوگا کہ اس اقلیم کے رہنے والے کس معراج اور اونچے خیالات کے آدمی تھے مورخین اس معاملہ کو خوب سمجھتے ہیں لیکن موجودہ زمانہ میں یہی قوم اور اس ملک کے باشندوں کا کیا طرز معاشرت زندگی ہے اور اُن کے کیا کیا طور و طریقہ ہیں حسب ذیل صفحوں میں قلمبند کیا جاتا ہے۔

مارواڑ (راجستان) انیس دیسی ریاستوں، لاوا اور کشنگڈھ خود مختار علاقوں و نیز اجمیر و میواڑ و آبو جو کہ برٹش مقبوضات میں ہیں ملاکر ایک صوبہ قایم کیا گیا ہے، اس کا رقبہ ۱۳۱,۶۹۸ مربع میل ہے اور مردم شماری تقریباً ۱۰,۳,۲۹۶۵۵ آہے اس صوبہ کے باشندوں میں ہندو، مسلمان، عیسائی تینوں مذہب پائے جاتے ہیں لیکن پہلے کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ ہندو مذہب میں کئی قومیں ہیں مثلاً راجپوت، برہمن، چمار، ویش و دیگر فرقے۔ اسی طرح نیز مسلمانوں میں شیخ، پٹھان، نومسلم، حاتم طائی، موہل، سندھی، ساہی، مشو، میراثی، گھوسی، لوہار وغیرہ ہیں۔ ہندوؤں میں کچھ جنگلی وحشی قومیں شامل کیجا سکتی ہیں مثلاً بھیل، مرسنے، سالتی، باوری وغیرہ۔ راجستان کی عام زبان مارواڑ ہے لیکن اسکی کئی قسمیں ہیں مثلاً ڈھونڈاری، میواڑی، بیکانیر، باگڑی، ہاروتی، میواتی وغیرہ لیکن یہ سب ہندو زبان کی شاخیں ہیں اور سبھی حصوں کے لوگ ایک دوسرے کی زبان سمجھ لیتے ہیں کیونکہ مارواڑی زبان کے ان تمام اقسام میں کوئی خاص فرق کی گنجایش نہیں ہے، سب لوگوں کی اصل یعنی مادری زبان ہندی ہے، مارواڑی زبان بولنے اور سننے میں سریلی شیریں معلوم ہوتی ہے اور اس سے ملک کی تہذیب کا پتہ چلتا ہے، اس زبان کی چند ضرب المثال حسب ذیل قلمبند کی جاتی ہیں، باوجودیکہ اتنی مختصر ہیں لیکن کس قدر شیریں و نصیحت آمیز ہیں:

۱۔ آئی چکا بیا ہو۔ موقع نکل جانے سے پھر صرف ہاتھ ملنا ہوتا ہے۔

۲۔ ٹھگا یا سو ٹھاکر باجے ہے۔ ایک بار دھوکا کھانے سے آدمی دوبارہ ہوشیار ہو جاتا ہے۔

۳۔ کلسوں ہووے جی کو پلسوں نہیں ہووے۔ جو کام ہوشیاری سے ہوسکتا ہے وہ زور اور قوت سے نہیں ہوسکتا۔

۴۔ روٹیاں بناں تو ما۔ میں تو کو بنی دے۔ بغیر دعا و تمنا جلوۂ نورانی حاصل نہیں ہوسکتا۔

۵۔ چھاج بولے بو باری بولے تو کیوں بولے چھالی تھارے اٹھوتر بیچ۔ ہنرمند تو خاموش ہیں اور جو جاہل ہیں وہ چاروں طرف گیان بکتے پھرتے ہیں۔

۶۔ اونٹ گھوڑا دے گدھو ڈو بھیجے۔ قصور کس کا اور سزا کون پائے۔

۷۔ سیدھے پر دوے چڑھے۔ سیدھے آدمی کو سب آزار پہنچاتے ہیں۔

۸۔ بنیوں متر نہ ویشیا ستی۔ کاگو ہنس نہ بگلو جتی۔ طوائف کبھی کسی کے ساتھ وفا نہیں کرسکتی، رنڈی کتنا ہی محبت کا اظہار کرے لیکن یہ نہ سمجھنا کہ وہ پاک محبت کرسکتی ہے، بگلا تالاب کنارے خوب دھیان لگائے بیٹھے رہتے ہیں لیکن وہ کامل نہیں بن سکتے اور کوا کبھی ہنس نہیں ہوسکتا۔

۹۔ ایک نہ بولنو سو دکھ ھرے۔ خاموشی اختیار

مارواڑ کے ھجڑے (مسلمان)

پاریہار خاندان کا راجپوت

مارواڑ کے میراثی (مسلمان)

مارواڑي ويش (كسان) كا لباس

زمانہ قديم كا زرہ بكتر پہنے ہوئے سپاهي

راجپوتوں كي خاص سواري

کرنے سے آدمی بہت سی برائیوں سے بچ سکتا ہے۔

۱۰۔ اوکھل میں ماتھو دھرے دیکھے دھمکار کیے گنتی۔ فرائض کے میدان میں آکر تکلیف و ایذا سے کیا خوف۔

۱۱۔ موج بل گئی پریٹ کو نہیں بلیو۔ شان و شوکت سب خاک میں مل گئی تب بھی غرور نہ ٹوٹا۔

۱۲۔ آپ بیاس جی بیگن کھاویں دوجے نہ پرمود بتاویں۔ خودرا فضیلت دیگراں نصیحت۔ یعنی آپ خود برا کام کریں اور دوسروں کو نصیحت دیں۔

۱۳۔ ماں بھٹیاری پوت فتح خاں۔ بڑی بڑی ڈیگیں مارنا و شیخی بگھارنا اور کرنا کچھ نہیں۔

مارواڑی زبان کی خوشخطی عجیب واقع ہوئی ہے مارواڑی زبان میں شاید ماتروں کی طرف توجہ نہیں دی جاتی اور اکثر دیکھا گیا ہے کہ اپنا ہی لکھا اپنے ہی سے نہیں پڑھا جاتا اور کبھی مرادی معنی سے مطلب بالکل جدا حاصل ہوتا ہے، مہاجنی موڑیا کا تو حال نرالا ہے اور کہا بھی گیا ہے:۔

نیک پوتر کاغذ لکھے؛ کانا مات نہ دیت
ہینگ مرچ جیر دیکھے؛ ہنگ مرچہ کردیت

اس کی ایک اور بہت زندہ مثال مشہور ہے، کسی نے لکھا "کک اجمیر گیا ہے نہ کک کٹے ہے" مطلب "کاکا اجمیر گئے ہیں اور چاچی کوٹا میں ہیں" لیکن پڑھنے والے نے یوں پڑھ لیا "کاکا آج مر گئے ہیں اور چاچی کٹی ہیں" اسی طرح مارواڑی زبان صاف نہیں لکھی جا سکتی، اس کے لئے بھی ایک کہاوت رائج ہے "آلا بنچے نہ آپسو + سوکھا بنچے نہ باپ سو" یعنی گولے حرف خود لکھنے والا نہیں پڑھ سکتا اور سوکھ جانے پر اُس کا باپ بھی نہیں پڑھ سکتا۔ مارواڑی لکھنے والے الفاظ کے درمیان فرق ذرا بھی نہیں چھوڑتے لیکن اب ہندی و انگریزی کی دیکھا دیکھی کچھ جگہ چھوڑنے لگے ہیں، لکھنے پڑھنے اور عام بول چال کی زبان میں اب کچھ ناگری و ہندی کا دخل ہوتا جاتا ہے۔

مارواڑی مرد و عورت کا لباس و پوشاک دوسرے صوبجات سے بیروں اور کچھ پرانے طور پر ہے، یہاں کے مردوں کا لباس زانو تک موٹے سوت کی دھوتی، کمری (بنیاین)، و انگرکھی (کرتا) اور پگڑی ہے، دیہات کے مرد زیادہ طور پر سوا سے دھوتی کے ننگے رہتے ہیں، کھادی یا گمر کا بنا ہوا ایک تولیا اپنے پاس رکھتے ہیں، کچھ مدت سے جو ذرا زیادہ شوقین ہیں وہ بنڈی یا انگرکھے کی جگہ بغیر کف کا کرتا پہننے لگے ہیں، مہاجن پیروں میں پائجامہ، سر پر ۹ گز لمبی و ۹ انچ چوڑی پگڑی جس کے کنارے پر ریشمی یا زری کا کام کیا ہوتا ہے باندھتے ہیں، اس کے باندھنے کے کئی طریقہ اور ڈھنگ ہیں، پوشاک میں سر پر باندھنے کو پیچ دار پگڑی راجپوتانہ میں مشہور ہے، جس کی خوبی یہ ہے کہ اس کے چاروں طرف ایک فیتہ علیحدہ سے باندھا جاتا ہے، اگر سادی ہوئی تو اُس کو اوپرنی کہتے ہیں اور اگر زری کا ہوا تو بالا بندی کہتے ہیں۔

اُس وقت لوگ سر پر پوتیا (پگڑی) کے عوض میں
صافہ باندھنے شروع کر دئے ہیں، بعض گول ٹوپی
بھی لگائے دکھائی دیتے ہیں اور اب چند ایسے
بھی ہیں جو انگریزی پوشاک و ہیٹ تک استعمال
کرنے لگے ہیں، عورتوں کا خاص اور عام لباس
(لہنگا) ہے۔ کانچلی جو کہ صرف سامنے چھاتی کو
ڈھنکتی اور پشت کی جانب تاگے سے بندھی رہتی
ہے، یا انگرکھی اور اوڑھنی ہے، یہ اوڑھنی (دوپٹہ)
قریب ڈھائی گز لمبا اور ڈیڑھ گز چوڑا ہوتا ہے
شہروں میں ان دنوں ساڑی کا رواج بھی پھیلتا
جارہا ہے اور بعض تو قمیص اور واسکٹ پہننے لگی
ہیں، مسلمانوں کا لباس ہندوؤں سے ملتا جلتا ہے
اور ان کی طرز معاشرت ہندوؤں سے بہت کچھ
مشابہت رکھتی ہے، زیادہ تر مسلمان یہاں کے
نو مسلم ہیں، صرف مستورات کہیں کہیں پر پائجامہ
و کرتہ و دوپٹہ پہننے کے لئے استعمال کرتی ہیں،
راجستان کی ہر قوم کا لباس تقریبًا ایک سا ہے۔

ہندوستان میں بعض مقاموں کی طرح پردہ
رکھنے کا رواج نہیں، عورتیں آزادی سے باہر
آجاسکتی ہیں، اُن لوگوں کے یہاں جہاں کہ
خدمتگار کام کرتے ہیں پردہ میں رہتی ہیں لیکن
کسان گھر کی عورتیں کنویں اور تالاب سے پانی
بھر لاتی ہیں، ناشتہ و روٹی لیکر کھیتوں تک
اپنے خاوند کے پاس چلی جاتی ہیں، اسکی وجہ
مجبوری بھی ہوسکتی ہے، اس لئے کہ اگر یہ کام
نہ کریں تو گرہستی کے کاروبار بند ہو جائیں، پردہ
کا رواج مسلمانی بادشاہت سے شروع ہوا،
اُس سے قبل راجا کی رانی بھی پردہ نہیں کرتی تھی
وہ جنگ، دربار اور شکار کے وقت برقع سے
عریاں رہتی تھیں اور مرد کی مانند ہتھیاروں کا
استعمال جانتی تھیں، اسی سے کئی قدیم پتھروں پہ
کُھدے ہوے الفاظ سے وہاں کی رانیوں کی
گرفتاری کا پتہ چلتا ہے، بیان کیا جاتا ہے
سرہند اودے پور میواڑ میں مہارانا سنگرام سنگھ
۱۵۶۵ سمبت تک اپنی رانی کے ساتھ شاہی تخت
پر جلوہ افروز ہوتے تھے اور پردہ کا خیال بالکل
ہی نہیں کیا جاتا تھا، آجکل لوگوں میں دولت
کی زیادتی کے ساتھ پردہ کا رسم بھی بڑھتا جارہا
ہے، دیکھنے میں آتا ہے کہ جیوں ہی کسی نے
پانچسو کی پونجی اکٹھا کی یا کسی ذریعہ سے ذرا اونچے
عہدہ پر مقرر ہوگیا فوراً پردہ کے مرض نے اُس پہ
قبضہ جمایا، اس میں خاص طور سے مسلمان جلدی
اور زیادہ اس مرض کے شکار ہو جاتے ہیں۔

یہاں کے باشندوں کی عام خوراک اور روزانہ
کا کھانا، گیہوں، باجرا، جو اور مکائی ہے، شہروں
میں زیادہ تر امیر لوگ گیہوں کا استعمال کرتے
ہیں لیکن کسانوں کی حالت اس معاملہ میں زیادہ تر
ترجیح کے قابل نہیں ہے، وے لوگ زیادہ تر دھان
روکھا سوکھا دلیا، کھیچ، سوگڑ وغیرہ سے پیٹ بھرتے
ہیں، جیسا کہ ایک مارواڑی کہاوت سے ظاہر ہے:۔

" کورا، کرسا، کھائے گیہوں جی میں بنیا"
یعنی کسان خراب غلہ روکھا وسوکھا کھاکر شکم پُری
کرتے ہیں اور باقی غلہ مہاجنوں کو قرض کی ادائگی
میں دیدیتے ہیں، ترکاری وسبزی کے واسطے
کمبھڑا، بھوگ، سانگری، پیلو وغیرہ کا استعمال
کرتے ہیں، انکو شلغم، گوبھی، آلو وغیرہ شاید ہی کبھی
تہوار کو بھی نصیب ہوتا ہو۔

چانول کھانے کو شاید تہوار ہی پر ملتا ہے حسب
بالاچیزوں کی تعداد و یافت اس طرح پر ہوتی ہے۔

سوگرا۔ باجرے کے آٹے کی موٹی سخت روٹی
جووزن میں کم سے کم سات یا آٹھ تولہ ہوتی ہے۔

راب۔ چھاچھ (دہی) میں باجرے کا آٹا
گھولکر اکثر صبح یا شام کو اُبال لیا جاتا ہے اور دوسرے
دن کھایا جاتا ہے۔

کھیچ۔ باجرے کو کوٹ کر اور اس کا چھلکا
اُتار کر چوتھائی حصہ موٹھ پانی میں لگاکر گاڑھا
بنایا جاتا ہے، اس میں کبھی کبھی کھاتے وقت تلی
کا تیل ملا لیتے ہیں۔

گھاٹ۔ مکا کا موٹا پیسا ہوا آٹا پانی میں
لگاکر گاڑھا بنا لیا جاتا ہے۔

دلیا۔ یہ باجرے کی آٹے کی گھاٹ ہی ہے
لیکن ذرا زیادہ رقیق ہوتی ہے۔

غریب لوگوں کو یہ پیٹ بھر بھی نصیب نہیں
ہوتا، زیادہ تر لوگ دن میں چار بار کھاتے ہیں
لیکن زیادہ تر یہ صرف شام کا کھانا ہے۔

سیراون۔ صبح کا ناشتہ
روٹی۔ دس بجے کا کھانا
دوپہرا۔ دو بجے دن کا طعام
بیالو۔ شام کا کھانا

یہاں کے کسان قناعت پسند اپنی باتوں کے
سچے وسادی زندگی بسر کرنے والے ہوتے ہیں۔
فطرتاً کچھ جفاکش ومحنتی ہوتے ہیں۔

کسان جس قدر دنیا کے فائدے اور آرام کے لئے
محنت کرتا ہے اتنا کسی اور پیشہ ور قوم کے لوگ
نہیں کرسکتے اسی لئے ہر ملک کے حکمراں و رہنمائے
سیاست وعلمائے اس بات کو اچھی طور سمجھ لیا ہے
اور ایک طرح سے علوم متعارفہ کا وصول ہوگیا ہے۔

گوالیار کے مرحوم راجہ خدا اُن کو جنت نصیب
کرے، ہز ہائنس مہاراجہ سرمادھوراے سندھیانے
۳۰ جنوری ۱۹۲۰ء کو اپنی تقریر میں ان لفظوں
کا اظہار کیا تھا:۔

" اب کسان زمینداروں کے ساتھ مجھے کوئی
پرہیز نہیں ہے جس طرح سے میں آپ کو اپنا سمجھتا
ہوں اُمید ہے کہ اسی طرح آپ بھی ہم کو اپنا
خیال کرینگے، میں آپ صاحبان کو " ان داتا "
یعنی " خوراک رسا " کا لقب دیا ہے، میرے رزق
کا دارومدار وزندگی کے بہار آپ لوگ ہیں اور
اس لئے " ان داتا " یعنی " روٹی رسا " استعمال کرنا
درست معلوم ہوتا ہے، تم میرے رزق رسا میں تمھارا
تابعدار، کمانے والے تمھیں ہو، جب تم فصل تیار کرکے

دوگے، تب ہی یہ بازیگر کا تماشا چلے گا۔

حال ہی میں ۲۴ ستمبر ۱۹۳۰ء کو بھوپال کے نواب صاحب نے اس سلطنت کی رعایا کی مجلس میں کسانوں کے متعلق یہ فرمایا ہے :-

"میں اپنے امرا و روساے شہر و نیز حکام عدالت سے اس بات کی درخواست کرنا چاہتا ہوں کہ ہر فرد بشر میری سلطنت کا کسان قوم سے محبت کرنا سیکھے، ان سے نرمی کا برتاؤ کیا جاے حقیقت میں کسان ہی ملک کی جان ہیں، وہ اپنی محنت کا پسینہ بہا کر کس جفاکشی سے غلّہ پیدا کرتے ہیں، لہذا ان کو اپنے سے ذرا بھی ذلیل وحقیر سمجھنا غلط فہمی ہے، اس مضمون پر میں نے اپنی عادات سے ایک نمونہ آپ لوگوں کے نظروں کے سامنے رکھدیا ہے اس لئے مجھے اختیار ہے کہ آپ لوگوں سے یہ عرض کروں کہ آپ اُن کے نزدیک جائے، اُن سے ملئے، اُن کے خوشی و رنج میں اُن کے معاون وحصہ بٹانے والے بنئے، اس طرح کی خدمتوں سے آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا، اسکے عوض میں وہ سب تمھارے احسانمند اور تم سے محبت کرنے لگیں گے، آپ لوگوں کو شہرت آفاق گولڈ اسمتھ کی یہ سطریں یاد رکھنا چاہئے

کسانوں کا شرف نظر شاہی ملک کے فخر کی بنیاد ہے
اگر ایک مار بھی برباد ہوا تو از سر نو نہیں جمایا جاسکتا

گجرات کے نامی عالم سری مالی برہمن کل دواکر پنڈت دلپت رام ڈھاڈو بھائی سی۔ آئی۔ ای نے بھی کسانوں کی تعریف اپنی مشہور وسادی نظم میں اس طرح کرتے ہیں اور تمام راحتوں کا منبع تصور کرکے اسکو تسلیم کیا ہے۔

"سروتھی پرتھم جے ڈرئیں سرشٹی ماں اناج بوایاں
جے نا کھیترنوں انہ جتی تھی ہوں جموں چھوں"
"اُپجاوے شیلڈی نے سوادشٹ ساکر کھانڑ
بھوجن کری نیہو سدیو سو سکھے بھموں چھوں"
"کرے چھے کپاس پیدا کپڑا بنے چھے جینا
ساری سجی سنٹر گار رنگ بھر رسوں چھوں"
"کرے چھے کھی نوں کام کھے چھے دلپت رام
ایوا ایک کرشک نے نیتہ نیتہ نموں چھوں"

شہر کے رہنے والوں کی حالت ضرور کسانوں سے اچھی دکھلائی دیتی ہے جو ظاہری بناؤ وسجاوٹ میں مشغول رہتے ہیں، ادھر کسان مفلس وتنگ حال ہوتے ہوئے بھی مہاجنوں سے قرض لیکر زندگی کے فرائض رسومات کو پورا کرتا ہے اور اس میں اپنی شان سمجھتے ہیں، اس مضمون پر کسی راجستانی شاعر نے خوب کہا ہے۔

"زیور بیچے گھر کو بیچے نکتا کرنا ہوتا ہے
نہیں کریں تو جات بھائی کا تانا سہنا ہوتا ہے
جات والے تو ایک دن جیمیں گھر والا نت روتا ہے
لڈو باج سب چین اُڑاویں وہ سکھ نیند نہ سوتا ہے"

جب کسانوں کے پاس ایک حبہ بھی نہیں ہوتا قرض دینے والا مہاجن سینہ پر سوار رہتا ہے اس وقت

مارواڑ کا لوهانا بنیا (مهاجن)

مارواڑ کي پوسال
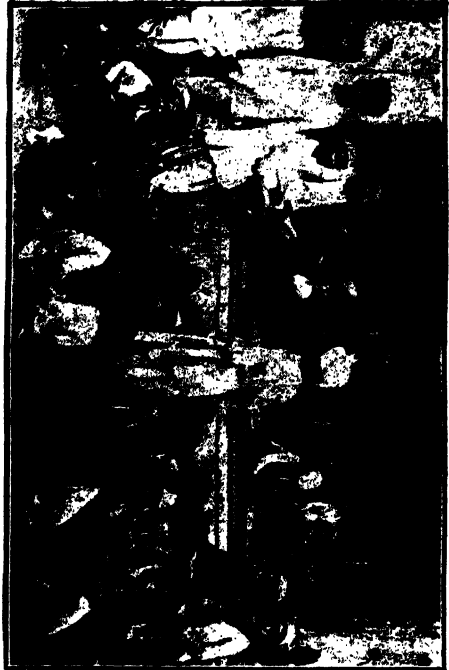
دروگا ذات کے بدقسمت لوگ
امیرون کي غلامي هي جنکا پیشہ هے

نئے دولها دولهن
جیپور کي شادی کا ایک جلوس

مارواڑ کے برتن بنانے والوں کا خاندان

ان کے پاس پیٹ بھر غلہ کھانے کو نہیں ہوتا لیکن یہ قوم اپنے قرض پر ڈیوڑھا، دوگنا سود لگاتی رہتی ہے جس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ وہ زندگی بھر قرضدار ہی بنی رہتی ہے، مطلب ان کا محض یہ رہتا ہے کہ کسان لوگ اس کے جنگل سے باہر نہ نکل سکیں۔

یہ بوہرے زیادہ ترکس قسم کے ہوتے ہیں اس کا ذکر جودھپور کے مہاراجہ پسر سردار جی سنگھ بہادر جی، سی، ایس، آئی نے اپنی مصنفہ کتاب " مائی پالیٹور " کے صفحہ ۱۴۱ میں اس طرح لکھا ہے۔

ہٹ میں چٹ میں ہانیں کھٹ میں مت میں کھوٹ
دل میں درساد سے دیا، پاپ لیا سر پوٹ

ترجمہ۔" بوہرے (مہاجن) کی دوستی میں، من میں، برتاؤ میں، خط (لکھاوٹ) میں اور اس کی نصیحتوں میں دھوکے بازی اور شعبدہ بھرا رہتا ہے وہ مہربان اور رحمدل ہونے کا بہانا کرتا ہے لیکن پراز گنہگا ہے، اگر ایک بار بھی کسی کسان کو اپنے جال میں پھانس لیتا ہے تو پھر اس سے رہائی دشوار ہے۔

قرضدار کی حالت کسی مارواڑی شاعر نے یوں بیان کی ہے۔

" نس دن نرکھے نیند سو نپا میں آوے نہ سکھ
دنیا میں نردین قرضہ سے لینا "

ترجمہ۔" خواب میں بھی قرضدار سکھ سے نہیں سوسکتا۔

لینو بھلو نہ باپ سے صاحب راکھے ٹیک

مطلب:" قرض اپنے باپ کا دیا ہوا بھی اچھا نہیں، خدا حافظ "

مختصر یہ ہے کہ بوہرے قرض دیتے وقت اور وصول کرتے وقت دونوں ہی موقعوں پر کسانوں کو خوب لوٹتے ہیں۔ ان کی چالاکی کا خاکہ کسی چارن شاعر نے خوب کمال سے کھینچا ہے۔

تول سانٹے تاکڑی ، تکڑی ڈھیک لگاوے
اڑو اکرے ادھار ، برنج بوار جیوں لپاوے
دیتا تو گھٹو دیوے ، لیتا بدھتو باوری
بڑیاں شکار انڑ بدھ مس، لیستی ہاتھ باوری

مطلب۔" ترازو کے تولتے وقت بوہرے (مہاجن) کسانوں کو وزن سے کم تولکر دھوکہ دیتے ہیں، ان کا قرضہ ایک دھوکے کی ٹٹی ہے، انکے لین دین میں ہر جگہ مکروفریب ہے" اس طرح ساہوکار گویا مہاجن کی شکل میں ایک ظالم روح ہے، یہ لوگ زبان پر رام رام اور بغل میں چھری ضروریات کے بوجھ سے دبے ہوئے کسانوں کو دھوکہ دینے سے باز نہیں آتے، اس لئے ایک کہاوت ان کے متعلق اور مشہور ہے۔

بنیا تہاری بان، کوئی نر جانے نہیں
پانی پیئے چھان، لوہی اڑھائیو پیئے

ایسے مکر پر بوہرے شیخی مارتے ہیں اور کہتے ہیں۔

" اوچھی اوچھی ڈانڈی راکھاں لانبی کنڈیاں
سرے نویں پاؤ تولاں، تو پانڑیاں نی جڑیاں

مطلب۔ ہم لکڑی کی چھوٹی چھوٹی ڈنڈی

رکھتے ہیں اور ڈوری لمبی رکھتے ہیں، ہمارا نام اصلی بنیا تبھی ہے۔ جب سیر بھر کے عوض تین پاؤ ہی تول کردیں، کسان لوگ ایسے بوہروں کو ابلیس سمجھتے ہیں۔ ایک کہاوت مشہور ہے " بوہرکو رام رام جم کو سندیشو ہے"۔ یعنی بوہرا (مہاجن) اگر رام رام (سلام علیک) کرتا ہے تو کسان سمجھتے ہیں کہ موت کے فرشتے کا پیغام آیا۔

مارواڑ ملک کے باشندوں کا روزانہ کام دیہات میں کھیتی باڑی کرنا اور شہر میں نوکری یا مزدوری سے ضروریات زندگی فراہم کرنا۔

۹۶ فیصدی باشندوں کی کھیتی باڑی سے پیٹ بھرتے ہیں اور یہی انکی اساس زندگی کا ذریعہ ہے، تین فیصدی ایسے ہیں کہ جو جانوروں کی خرید و فروخت کا پیشہ کرتے ہیں، گائے، بیل، گھوڑا، اونٹ، بھینس، بھیڑ اور بکری اس ملک میں اچھی نسل کے پائے جاتے ہیں، ناگور کے بیل صورت و جسامت میں خوبصورت اور کام میں تیز و توانا ہوتے ہیں، گائیں تھلی یعنی ریگستان کے علاقہ کی مشہور ہیں۔

جودھپور ریاست کے پرگنہ سانچور کی گائیں قریب قریب ۱۵ اسیر دودھ دیتی ہیں، نسل یعنی اولاد کے لئے ناگور کے بیل اور سانچور کی گائیں اچھی ہوتی ہیں، گو کہ زمانہ کی ہوا لگنے سے یہاں بھی شہروں میں دودھ کی کمی ہونے لگی ہے لیکن تاہم دیہات میں ابھی گھی اور دودھ خالص ملتا ہے، بہت سے گاؤں میں لوگ دودھ کی قیمت لینا حرام سمجھتے ہیں، واونٹ بھی مارواڑ میں تیز قدم و توانا ہوتے ہیں، سواری کا اونٹ جا گھوڑا کہلاتا ہے جو بارہ گھنٹہ میں دوسو میل جا سکتا ہے لیکن اسکی قیمت پانچسو یا چھ سو روپیہ سے کم نہیں ہوتی، اونٹ یہاں بڑے کام کا جانور ہے، اونٹ کی تعریف کسی شاعر نے یوں کی ہے۔

اونٹ سواری دے
اونٹ پانی بھر لاوے
لکڑی ڈھووے اونٹ
اونٹ گاڑی لے دھاوے
کھیتے جوتے اونٹ   اونٹ پتھر بھی ڈھووے
جو نہ ہووے اونٹ   لوک کرموں کو روے
کوئی کہنہ دھیہ تو ماچی جیسے کو تیسا ملے
بن جنترو پھرنٹ میں کہو کام کیسے چلے

مارواڑی گھوڑے بھی بہت تیز اور مضبوط ہوتے ہیں، ان میں سے بعض ۱۵ یا ۱۶ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے جا سکتا ہے، سب سے اچھی نسل کے گھوڑے ریاست جودھپور کے مالانی پرگنہ میں ہوتے ہیں اور ان میں سے بھی گوڑھا وراج دھرے کی زمین ان کے لئے مشہور ہے، بیان کیا جاتا ہے کہ کسی بادشاہ نے اپنے عربی گھوڑوں کی خاطر عرب سے ریت منگائی تھی جسکو ایک بنجارہ ایک لاکھ بیلوں پر لاد کر دہلی لئے جاتا تھا، لیکن

جبکہ وہ راج دھر نامی گاوں کے نزدیک تھا خبر ملی کہ بادشاہ حکم الٰہی سے راہی عدم ہوگیا ہے مایوس و نا امید ہوکر اس نے سب ریت اُسی جگہ ڈالدی، اس کے انبار سے ایک ٹیلہ ایسا بن گیا ہے، اس پرگنہ کے باشندے اپنے گھوڑوں کے بچھڑوں کو لاکر اسی جگہ لُٹاتے ہیں، یہاں کے گھوڑوں کی خاصیت عربی اسپوں سے اسی لئے مشابہت رکھتی ہے، راج دھڑے کے رہنے والے اپنی سرزمین کی بڑی تعریف کرتے ہیں اور اپنے پرگنہ پر بہت نازاں رہتے ہیں جیسا کہ حسب ذیل قصہ سے ظاہر ہوگا۔

راج دھرے کے حکمراں کی دختر کی شادی سروہی کے راجہ سرتان سے ہوئی تھی، یہ دونوں عالم و لائق تھے اور اکثر آپس میں شاعری پر بحث کیا کرتے تھے اور دونوں فطرتاً شاعری طبیعت کے تھے، ایک دن موسم بہار میں آبو پہاڑ کی فضا و کیفیت کو دیکھکر راجا نے یہ شعر کہا

ٹوکے ٹوکے تیکی جھرنے جاے
ادبد کی چھب دیکھتا اور نہ آوے داے

مطلب۔ "پہاڑ کی چوٹی چوٹی پر تو کیتکی بہار سے کھلی ہوئی جھوم رہی ہے۔اور پانی کے جھرنے جھرنے میں چنبیلی (یاسمن) مستانہ وش لہریں لے رہی ہے۔ ایسا سماں و منظر چھوڑکر دوسری جا جانے کا جی بھلا کیوں چاہے"۔

تب رانی نے جو پیدل چلنے کے باعث ذرا تھک گئی تھی اور جس کے وطن میں سروہی پرگنہ سے زیادہ گیہوں کی کاشت ہوتی تھی اس طرح ایک شعر کہا

جب کھانڑوں پھکڑوں جہر پالو چلنو پنتھ
آبو اُوپر بسڑوں بھلو سرا یو کنتھ

ترجمہ۔ جو کھانے پڑتے ہیں زہر یعنے افیون چکھنی پڑتی ہے اور پاپیادہ چلنا ہوتا ہے واہ جی آپ نے خوب اپنے آبو کی تعریف کی، راجہ نے جب یہ سُنا تو کچھ بُرا مانا اور برافروختہ ہوکر پوچھا کیا آبو تمھارے ریگستانی اور اجاڑ ملک سے بھی گیا گذرا ہے، رانی نے یہ کہا کہ ہمارے پرگنہ کی کیا تعریف وہ تو فرشتوں کے لئے باعث فخر ہے اور اس کی تعریف میں یوں کہا

گھر ڈھانگی آلم دھڑیں پرکل لونڑیں پاس
لکھیو جنڑے لا بھ سی راڑدھڑ اروباس

مطلب۔ جہاں پر ڈانگی نام کی ریت کی زمین ہے اور جس میں عمدہ گھوڑے ہوتے ہیں وہاں پر سب بڑے دیوتا نواس کرتے ہیں، ایسی سرزمین کی بودوباش جس کی قسمت زور آور ہوگی اس کو نصیب ہوگی۔

مارواڑ اور اس کے قرب و جوار میں تقریباً ۷۰ فیصدی لوگ گاوں میں رہتے ہیں اور انکی حالت ظلم زمینداران، زیادتی لگان، قحط فصل جہالت، وبا اور آخر میں مہاجنوں کی دست درازی سے اس قدر قابل رحم ہورہی ہے کہ یہ بیچاری نام

کی زندگی رہتے ہیں اور مصیبتوں سے زندہ درگور ہیں، میواڑ میں محض ۲۴۴ کارخانے ہیں ان میں کام کرنے والے مزدوروں کی تعداد تقریباً ۱۹۱۶۵ ہے جن کو ۱۲ سے پندرہ گھنٹہ روزانہ کام کرنا پڑتا ہے ان مزدوروں میں ۸۸۵ عورتیں و تقریباً ۱۰۲۹ ان بچوں کی تعداد ہے جن کا سن چودہ برس سے کم ہے، یہاں پر کئی ذاتیں تو اس صفات کی ہیں کہ ان کا کوئی ذریعہ معاش نہیں اور وہ پیدائشی مجرم تصور کئے جاتے ہیں، ان میں کنجر، سانسی، باوری، مینا وغیرہ قومیں ہیں جن کے ہر فرد بشر کو ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں میں جانے وقت پولیس کا پروانہ لینا لازمی ہے ورنہ شبہہ میں جیل کی ہوا خوری کرنی پڑتی ہے، یہ لوگ مارواڑ کے ہر ایک ریاستوں میں کچھ نہ کچھ تعداد میں ضرور پائے جاتے ہیں اور ان کی مردم شماری قریب ایک لاکھ ہے، ان کو مہذب بنانے کی کوشش کبھی کوئی نہیں کرتا، ہر بڑی ریاست کے صدر جیل میں اور ان کے گاؤں میں اگر مدارس قائم کئے جاویں اور ان کو تعلیم کا فیض پہنچایا جائے تو یہ ضرور ایک مہذب و لائق قوم بن سکتی ہے، کیا امید کی جائے کہ ریاست کے امرا و کارپرداز اس طرف توجہ دینگے، کسی ریاست کے گاؤں اور قصبہ میں میونسپلٹی کا کیا ذکر —— کسی جا صفائی و روشنی کا بندوبست تک نظر نہیں آتا، اسپتال و شفاخانہ کا گاؤں میں تو مشکل سے نام سنائی دیگا

اس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ بہت سے قبل از وقت موت کا لقمہ بن جاتے ہیں یا دیہات میں ایسے جاہل وید ہیں کہ نیم حکیم خطرۂ جان کا معاملہ ہے۔ موت ناگہانی ہو جاے پر غریبوں کو سوائے اسکے کہ ایشور کی مرضی تھی اور کوئی تسلی یا راحت کا سامان نہیں، یہ ذکر راجدھانیوں اور بڑے قصبہ کے لئے نہیں ہے، راجپوتانہ میں تعلیم کی حالت بہت گری ہوئی ہے، اجمیر و مارواڑ کو چھوڑ کر تمام دیسی ریاستوں میں پڑھنے لکھنے کا بندوبست بہت ہی خراب اور اس کا انتظام بہت ہی ذلیل ہے۔ اسکی خاص وجہ یہ ہے کہ جس قدر توجہ اور دیگر محکموں کی طرف کیجاتی ہے اتنا تعلیم کی طرف اس کا دسواں حصہ بھی نہیں ہوتا، ایک کروڑ کی آبادی میں سے صرف تین لاکھ لوگ پڑھنا و لکھنا جانتے ہیں گویا کل ۳ فیصدی تعلیم یافتہ ہیں لیکن یہ واضح رہے کہ ان میں ان لوگوں کی بھی تعداد شامل ہے جو صرف اپنی دستخط ہی کرنا جانتے ہیں اور سوائے اس دستخط کے دوسرے تعلیمی معاملات میں صفر ہے، مستورات کی تعلیم کا تو پھر کیا کہنا، ماشاء اللہ، ایک ہزار میں سے صرف دو عورتیں ایسی ملیں گی جو لکھنا و پڑھنا جانتی ہوں، لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کے لئے تو کوئی انگریزی اسکول نام کو بھی نہیں، ہندی و اُردو کے سرکاری اسکول ریاستوں میں ضرور ہیں لیکن وہ بھی بے توجہی و بے پروائی کی وجہ سے ایک اُجڑے ہوئے دیار کی طرح ہو رہے ہیں، لڑکوں کے واسطے ریاست میں

کچھواہا ذا دان کا راجپوت

کچھواہا کھانپ کا راجپوت

راجپوت مجلس (گہلوت خاندان)

کپڑے چھاپنے اور بیل بوٹے کا کام کرنے والے (مسلمان)

مارواڑ کي جاٹ (زمین کي کاشت کرنے والے جاٹ)

مارواڑ کا سانڈ

مارواڑ کے بھیل
[ڈاکہ اور چوری کے لئے مشہور ھیں]

دس پانچ ہائی اسکول و کالج ضرور ہیں، دیسی ریاستوں میں اور اُن کے ماتحت جاگیر میں راجہ اور رئیس فضول خرچی میں نقد زر پانی کی طرح بہاتے ہیں لیکن ایسے پبلک کارناموں کے لئے مجبور ہیں، ریاستوں کے سالانہ آمد و خرچ کا بجٹ دیکھنے سے صاف معلوم ہو سکتا ہے کہ کس قدر روپیہ تعلیم کے محکمہ میں اور کتنا خرچ اُن کے خانگی اخراجات میں ہوتا ہے، بیکانیر، جودھپور اور الور ریاست میں تعلیم کے اخراجات ۱.۵ و ۲ و ۱ فیصدی ایک ایک کا باری باری ہے۔ اور خانگی اخراجات ۱۴ و ۱۶ و ۵۰ فیصدی ہے۔

اُدھر بہت سے جاگیرداروں کی یہ رائے ہے کہ اگر تعلیم کا سلسلہ بڑھایا گیا اور دیہاتوں میں زیادہ مدارس کھولے گئے تو دہقانی تعلیم یافتہ ہونے پر اپنے حقوق کے واسطے زیادہ زور ڈالیں گے جس سے ہماری حکومت ظالمانہ میں خرابی پیدا ہو جائیگی۔ اس خیال کے پیرو کار اپنی ریاستوں اور زمینداری میں اسکول کھولنے کی نہ تو ہمت افزائی کریں اور نہ اجازت ہی دیں، ریاست جودھپور جو کہ ایک غیر معمولی و بڑی ریاست ہے وہاں کا بھی یہی حال ہے جو دربار کہ جودھپور میں ۱۹۲۳ء کے سالانہ رپورٹ صفحہ ۴۴ سے صاف ظاہر ہے، ہم یہاں پر جھالاوار مہاراج کی تعریف و تحسین بغیر کئے نہیں رہ سکتے جنکی ریاست میں محکمۂ تعلیم پر زیادہ حصہ آمدنی کا صرف میں لایا جاتا ہے، ایسے مہاراج کو شکریہ ادا کرنا چاہئے، یہ حالت محض وہاں کے عوام الناس ہی کی نہیں ہے بلکہ جاگیرداروں اور رئیسوں کی بھی ہے، راجپوتانے میں راجپوتوں کی مردم شماری ۶۰۲۰۰۴ ہے جس میں تعلیم یافتہ لوگ محض ۱۲۵۲۹ ہیں، پڑھنے لکھنے کی طرف انکو شوق ہی نہیں ہوتا، اگر اپنی دستخط کرنا سیکھ لی تو اپنے کو بڑا عالم سمجھنے لگتے ہیں، اس سے ٹھاکروں کو بہت نقصان اُٹھانا پڑتا ہے، کسی ٹھاکر صاحب سے پوچھا گیا کہ "ٹھاکراں کتنا پڑیا" (یعنی ٹھاکر صاحب آپ کتنا پڑھے ہیں) ٹھاکر صاحب نے جواب دیا "ہاتھ سوکرم پھوڑا جتا" (یعنی ہاتھ سے اپنی بربادی کر سکیں اتنا) خلاصہ مطلب یہ ہے کہ وہ صرف بھورے (مہاجن) کے دست آویز اور رقعہ پر اپنی دستخط کر سکتے ہیں، تعلیم نہ حاصل کرنے کی وجہ سے آپ کے خیالات بھی بہت پیچھے رہتے ہیں اور موجودہ روشنی و تہذیب سے بالکل بے بہرہ ہیں زیادہ تر سرداروں اور رئیسوں کی یہ خراب و خستہ حالت دیکھکر کئی سال پیشتر مسٹر اے رگبھ میکے نے اپنی کتاب "دی نیشن آف انڈیا" میں یوں بیان کیا ہے۔ "وے بہادر سورما راجپوت کہ جو اپنے خاندان کو سورج اور چندر بنشی بتلاتے تھے اور جو جوہر اقوام و ملل تھے جہالت اور عیاشی کے چکر میں آکر اس قدر رسوا اور ذلیل ہو گئے ہیں کہ انکے پچھلے شاہانہ کارنامہ و دانشمندی و فیاضی کا حال سنکر جگر پاش پاش ہوتا ہے، ایک وہ وقت تھا کہ ہندوستان کا نام ان کے جوہر آبدار تیغ و سخاوت

دل و دماغ سے شہرۂ آفاق ہو رہا تھا اور آج یہ حالت
ہے کہ اُنہی تلوار میں زنگ لگ رہا تھا اور سخاوت کے
عوض عیاشی و نشہ میں روپیہ گنوایا جا رہا ہے، ان
دنوں کے راجپوت اپنی زبان میں بھی خواندن و
نوشتن نہیں جانتے، سیاست و اُمورات ریاست
کے انتظام سے اس قدر بے بہرہ ہیں کہ ہر چہار طرف
بد انتظامی نے اپنا قبضہ جما لیا ہے، گرہستی کا بندوبست
تو کر نہیں سکتے، جوانی میں بُری صحبتوں میں بیٹھکر
بُری چیزوں کے عادی بن جاتے ہیں جس کا آخری
فیصلہ شدہ انجام ذلت و بربادی ہے، وے راجپوت
کہ جن کا بستر ننگی زمین اور اُوپر کھلا ہوا آسمان اور
زیب تن زرہ بکتر ہوتا تھا، اب شراب و افیون کے
نشہ میں چور انگڑائیاں لیا کرتے ہیں، اپنے کام کاج
کی کچھ بھی خبر نہیں رہتی، نوکروں اور خدمتگاروں
نے بھی من مانی راج منا رکھی ہے، جو جی میں آیا
کرتے رہتے ہیں، بیہودہ عادتوں سے اخراجات اس قدر
بڑھ گئے ہیں کہ ہر ریاست پر تقریباً قرضہ لدا ہوا ہے
لیکن سردار کو اس بات کی کیا فکر "آج جو موجود ہے
اس کو اُڑا لو کل کے دینے والے رام ہیں" ظاہری
شان و شوکت کا بس خیال دل میں ہر وقت بسا
رہتا ہے، مختصر یہ کہ اُنکی آرزو و دلی تمنا یہی رہتی
ہے کہ جہاں کہیں جاویں توپیں سلامی دیں، قالین
راستہ میں بچھایا جاوے اور چند گھوڑے سوار زرق برق
پوشاک پہنے ہمراہ ہوں اور یہ بھی خواہش رہتی ہے
کہ اُنکی لڑکی کی شادی نابالغی میں جلد سے جلد

کسی اونچے خاندان میں ہو جاوے، ہندوستان کے
دیگر صوبہ جات کی مانند راجپوتانہ میں بھی لڑکپن
کی شادی کا رسم ہے اور اکثر لڑکیاں بازار کے
سودا کی طرح خرید و فروخت کی جاتی ہیں۔
لڑکپن کی شادی و بیواؤں کی آو سرد راجپوتانہ
کے لئے کسی روز مُضر ثابت ہوگی جس سے تمام
قوم کو وہ زخم کاری لگے گا کہ کوئی مرہم اچھا نہیں
کرسکتا، یہاں کے عورتوں کی تعداد ۵۹،۴۹۳
۶۴، ہے اس میں شادی شدہ عورتوں کی تعداد
۲۱،۲۹،۱۵۵ اور بیواؤں کی تعداد ۸،۸۳،۲۸۹
ہے، شادی شدہ عورتوں میں ۱۴ فیصدی بیوہ ہیں
جوان اور لڑکپن کے بیواؤں کی تعداد ایک لاکھ سے
کم نہیں اور ان میں تو بہت ایسی ہیں جنہوں نے
شاید اپنے شوہر کا منہ بھی نہ دیکھا ہوگا، افسوس
راجپوتانہ کس روز اس کمزوری پر فتحیاب ہوگا،
یہ حال تو غریب و کسان کے گھرانوں کا ہے، محلوں
میں اس کے خلاف تماشا دیکھنے کو آتا ہے، جو لوگ
صاحب مرتبہ و روپیہ والے ہیں یا جاگیردار ہیں اور
پھر راجہ مہاراجہ کا کیا کہنا، ایک دو بی بی سے
کہیں خواہشات کو اطمینان و تسلی ہوسکتی ہے،
کسی کے دس ہیں تو کسی کے بیس اور اکثر پچاس
و سو بھی جائز ہیں، راجستان میں ایک دو
مہاراجوں کو چھوڑ کر اور کچھ جاگیرداروں کو علحدہ
کر دیئے پر باقی سبھوں کے ایک سے زیادہ بیویاں
ہیں، راجپوتانہ کے خاص تباہی کا باعث یہ بھی

ایک بڑی رسم یا عادت ہے، مہاراج دشرتھ کو کئی شادیاں کرنے کا انجام رامچندر جی کو بھگتنا پڑا، اشوک کے کئی بیاہ ہونے کی وجہ سے موریا نسل کا زوال شروع ہوا، مشہور ہے چندر گھروار کے خاندان کی بربادی کی وجہ بہت زیادہ شادی ہونا خیال کیا جاتا ہے۔

ریاست کے اہلکار (مسدی) ایک سے زیادہ بی بی رکھنے میں اپنی عزت خیال کرتے ہیں، اگر حقیقت سے دیکھا جاوے تو یہ کس قدر رسوا بات ہے اور کتنا مذہب و شرافت کے بعید، چند ریاستوں میں لڑکپن کی شادی، ضعیفی کی عمر میں نکاح و لڑکی فروخت کرنے کی عادت روکے جانے میں کوشش کیگئی ہے اور لوگ اس کے سخت خلاف وان رسومات کے معترض ہیں لیکن ایسی ریاستیں بہت کم ہیں بھرت پور، کوٹا و نیز بیکانیر میں یہ قانون بنا دیا گیا ہے کہ لڑکے کی عمر ۱۶ برس اور لڑکی کی عمر ۱۳ برس کم سے کم شادی کے وقت ہو لیکن ایسے قوانین کا اثر ابھی بہت کم ہوا ہے کیونکہ اسکی پابندی سختی سے نہیں کی جاتی، جو اخلاقی تبدیلیاں کہ مصطفےٰ کمال پاشا نے ٹرکی میں کر دکھایا وہ ایک صدی میں بھی . . . . مشکل تھے، یہ ہمارے ملک میں بھی ہو سکتا ہے، کاش کہ راجا اور حکمران ریاست اس کی طرف دلی توجہ ڈالیں، راجپوتوں کے یہاں رئیسوں و راجاؤں میں یہ رسم چلی آتی ہے کہ اپنے خاندان کے لڑکیوں کی شادی اپنے سے بڑے رئیس و بڑے مہاراجہ کے گھر میں ہو، شوہر کی تعلیم و تربیت، صحت و چال چلن پر بالکل توجہ نہیں دیجاتی، یہ سب تیسرے درجہ کی باتیں ہیں، اور کہیں کہیں تو یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ رئیس و شریف خاندان کی بیٹیوں کی شادی ہی اسی بنا پر نہ ہوئی اور ان کی تمام زندگی کنواری رہنے میں گذر گئی لیکن یہ واضح رہے کہ اس کا انجام اخلاق پر بہت بُرا ہوا ہے اور خاصکر ایسی جگہ تو پاسبانوں کو مزا رہتا ہے اور کوڑی کا پانسہ تو انھیں کا تیز ہوا کرتا ہے، ان بُری اور مہلک رسومات سے ملک کو محفوظ رکھنے کے لئے کرنیل والٹر (اے۔جی جی) نے ایک مجلس مقرر کی، دوسرے سال سالانہ جلسہ مورخہ ۱۵ ار فروری ۱۸۸۹ء کو اجمیر میں ایک مجلس پھر منعقد کی گئی اور اس کا نام "والٹرکرت راج پتر ہت کارنی سبھا" رکھا گیا، راجپوتانہ میں بیشمار راجہ و مہاراجہ ہوتے ہوئے بھی اس کے صدر نشین اے جی جی مقرر ہوئے، اس مجلس کی شاخیں تقریباً ہر ریاست میں اب بھی قائم ہیں لیکن اس کا اثر جیسا کہ اُمید کی جاتی تھی اُتنا نہیں ہوا اور وہ بُری رسومات اب بھی ملک میں گھر کئے ہوئے ہیں۔ اس رسم کا ایک اور بھی بُرا انجام دکھائی دیتا ہے بیاہ و شادی میں اس قدر اخراجات کی ضرورت ہوتی ہے کہ بہت سے امیر گھرانہ اسی کے واسطے غریب و تنگدست ہو گئے اور بہت سے بیٹی والوں کی شادی ہی نہ ہو سکی، بہت سی عورتیں ایسی ملینگی کہ

جن کا شباب ڈھل گیا اور وہ مایوس شادی کی طرف
سے ہوگئیں، بے وقت و ناموزوں شادیوں کا یہ پھل
ہوا کہ بہت سی بیوہ ہو کر رنج و الم کے جال میں
پھنس گئی ہیں اور اب اُن کو کوئی سہارا زندگی کا
نہیں رہا، اگر حسب بالا مجلس کے اہل شریف اسکی
طرف فکر کریں تو ممکن ہے کہ بہت سی بُرائیاں
ہمیشہ کے لئے دور ہو جائیں اور قوم کی حالت از سر نو
پھر سدھر جاوے، کیونکہ مجلس کو مثالوں کی ضرورت
دکھلانے کو نہیں ہے، ہر شخص ان بُرے رواجوں
سے پریشان و عاجز ہو رہا ہے، صرف اگر مجلس راستہ
دکھلاوے اور خود نمونہ پیش کرے تو بہت ہی جلد
تمام ملک میں ایک انقلاب ہو جائے اور تمام قوم
کی کایا پلٹ ہو جائے۔ راجپوتوں میں تمباکو و افیون
پینے کی عادت دن بدن بڑھتی ہی جا رہی ہے،
آکھا تیج، ہولی، دیوالی و نیز شادی کے موقعوں پر
افیون پانی میں گھولکر دیجاتی ہے، دربار ریاست
میں افیون کی بڑی قدر کی جاتی ہے، کسی شاعر
نے کہا ہے:۔

"امل تو اُو مادیا
سینا ہنداسین
تھاتس گھڑی آن اورے
پھیگا لاگے نیر

مطلب:" اے افیون تیرا نشہ آنے پر بدن
میں چستی و ہوشیاری آجاتی ہے، تو دوستوں میں
سب سے اچھا دوست ہے، تیرے بغیر مجھے ایک لمحہ
بھی چین نہیں آتا اور تیرے فراق میں زندگی سے
بیزار رہتا ہوں، آنکھوں میں رنگت نہیں آتی"

اسی قسم کی نظمیں و بیت خوشامدی رئیسوں
اور راجاؤں سے کہا کرتے ہیں اور کاہلوں کی طرح
افیون کھا کر بیش قیمت وقت کو پینک میں گذار دیتے
ہیں، وہ قوم کہ جو حکومت کے لحاظ سے دنیا میں سب
پر فوقیت پا چکی تھی اُسی قوم کی یہ ذلت! کہیں کہیں
پر شرابخواری و میخانہ جوئی نے اور بھی ایک نیا
گل کھلا رکھا ہے، حکمراں کی مثال دیکھکر رعایا نے
بھی پیروکاری اختیار کی جس کا انجام یہ ہوا کہ
گھر گھر میں تقریبًا اس کا چرچا ہوگیا، دھولی
رنڈی، بھانڈ سبھوں نے بادۂ ناب کی تعریف
کر کرکے راجاؤں و رئیسوں کو خوب ہی اسکا غلام
کر دیا ہے اور روز بروز اس صحبتِ بد کا نتیجہ
شرابخوری کی زیادتی ہے۔

۱- دارُو پیو رنگ کرو ؛ راتا راکھو میں
۲- بیری تھارا جل مرے ؛ سکھ پاوُ ویلا سین
۳- دارُو دلّی آگرو ؛ دارو بیکا نیر
۴- دارو پیو صاحبا ؛ کئی سو روپیا رو پھیر
۵- دارُو تو کھبک کرے ؛ سی سی کرے پکار
ہاتھ پیالو دھن کھڑی ؛ پیوُ راجکمار
۶- بھرلا رو سوگھڑا سجنی ؛ دارڑو دا کھانڈو
پیون والا لاکھاں رُو ؛ بھرلا اے سگھڑ
سجنی دارو ڑو دا کھان رُو

"سجنی! بادۂ انگور بسیار کہ پینے والا لاکھوں روپیوں کا آدمی ہے۔"

امریکہ کے اس بارہ سالہ لڑکے نے حال ہی میں کھیلتے کھیلتے ایک ۳۸ من کے گینڈے کو اپنی بندوق کا شکار بنایا تھا - اپنی کامیابی کی شان میں بہادر لڑکا اپنے شکار پر بیٹھا خوش ہو رہا ہے -

کماری ملموہنی زتشی

[آپ لاہور کے گورنمنٹ کالج کی ایک ہونہار طالبعلم ہیں آپ ہی پنجاب جہاتر سبھاں کی استقبالیہ کمیٹی کی صدر مقرر ہوئی تھیں]

شریمتی کے - ناگرتنم

[آپ کلکتہ یونیورسٹی کی بی - ایس - سی ہیں اور اسی یونیورسٹی میں لکچرار کا بھی کام کرتی ہیں]

شریمتی جنبائی روکڑے
[آپ بمبئی کی جسٹس آف پیس حال ہی میں مقرر ہوئی ہیں]

راجکماری کارتکا تروتل
[آپ مہاراجہ ٹراونکور کی بہن ہیں - ریاست کی طرف سے آپ چیف گرلز گائیڈ مقرر ہوئی ہیں]

شریمتی یو - ایھمبل
[میسور کے ویمنس کالج میں آپ پروفیسر ہیں - آپکو میسور گورنمینٹ نے اونچی تعلیم حاصل کرنیکے واسطے ولایت بھیجا ہے]

چھل بلیا گھوڑا بھلا ۔۔ البیلیا اسوار
مد چھکیا مارو بھلا ۔۔ مرون نکھا دار

مطلب :- جس طرح بے چین و شاندار گھوڑا اور اُس پر البیلا سوار، اسی طرح نشہ سے مخمور نایک اچھے معلوم ہوتے ہیں اور ریا جیسی نخرے باز نایکہ

مارُو مجلسیا بھلا ۔۔ گھوڑا بھلا کومیت
ناری تو نیلی بھلی ۔ کپڑو بھلو سپیت

(مارو) مرد جو مجلس آراستہ کرتا ہے وہ بھلا ہوتا ہے، جو گھوڑا ابلق ہوتا ہے وہ اچھا ہوتا ہے عورت گلاب کے پھول کی طرح ملائم اچھی ہوتی ہے اور کپڑا یعنی لباس (سفید) اچھا ہوتا ہے ۔

کستوری کالی بھلی ۔۔ راتی بھلی گلال
رسیا تو پتلا بھلا ۔۔ جاڑا بھلا حلال
مد چھکیا مہراج تھانے کن پلائی دارو نی
لوبے نی دارو را مارو پوچھے تھاری مارو نو
ماروں تھارا تو مسوں رویا نی لاگنو
ہو پیاری ماروں تھارا نیا رویا نی لاگنوں
میں کہاں جگاؤں رے دارو کو مارو سو تو نیند میں

اس ملک کے رعیت کا تو پھر کیا کہا جاوے برٹش ہندوستان کی رعایا سے کہیں پیچھے پڑی ہوئی ہیں ۔ جہالت یا اپنے حقوق سے ناجانکاری یا ناواقفیت یہ سب یہاں کی خاص بُرائیاں ہیں ایسی حالت میں اگرچہ اُن پر کوئی بھی ظلم کیا جاوے تو کون روک ٹوک کرنے والا ہے ، برطانیہ حکومت کے زیر سایہ سے بیگار اور خلاف مرضی مزدور سے کام لینا بالکل اُٹھا دیا گیا لیکن راجپوتانہ اور مالوہ کے صوبہ میں ابھی یہ رسم اسی طرح قایم ہے یہاں کی غریب و تنگدست رعایا میں سے چمار و بھیل کی قوموں کو اکثر بلا مزدوری ہی کام کرنا پڑتا ہے ، ایسی بیگاریوں کی تعداد تقریباً ۱۸،۵۳،۷۲۶ ہے یعنی کل مردم شماری کا ۱۸ فی صدی بیگاری کے لوگ ہیں ، جاگیردار لوگ نائی ، کمہار ، کھاتی ، جاٹ ، مالی ، گوجر وغیرہ مرد و عورتوں سے بلا کوئی مزدوری دئے ہوئے کام لیا جاتا ہے ، اس رواج کے مطابق کوئی بھی دربار کا اہلکار جب اُسکی طبیعت آئے ان لوگوں سے زبردستی کام کروا سکتا ہے ، ہر گاؤں میں روزانہ دو چار بیگار برابر ہوا ہی کرتی ہیں ہیں ، پٹواری یا کوئی اہلکار اگر ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں میں منتقل ہوتے ہیں تو اُن کا بستہ و کتابیں بیگار ہی لیجایا کرتے ہیں ، یہانتک کہ معمولی سے معمولی کام کے لئے غریب پکڑے جاتے ہیں ، ان لوگوں سے حسب ذیل قسموں کی بیگار لی جاتی ہے ۔

بھانبی ذات کی عورت و مرد سے دانا دلوانا ، گھاس کھدوانا ، چمڑے کے سامانوں کی مرمت کروانا و زنانخانہ و مردانہ کمروں کی صفائی بغیر کسی مزدوری کے کرائی جاتی ہے ، سرگا ذات کے مرد قاصد و پیغام لیجانے کا کام کرتے ہیں ، شادی

اور بیاہ وغیرہ کے ایام میں باجہ بھی بجاتے ہیں، اگر خود بیماری یا اور کسی وجہ سے غیر حاضر ہو جائیں تو اپنے عوض میں کسی کو ان خدمتوں کے پورا کرنے کے لئے بھیجنا پڑتا ہے، بیماری کوئی بہانہ اس کے لئے نہیں ہوسکتی، حجاموں (نائیوں) سے ہر شب کو گھر کے چراغ جلوائے جاتے ہیں، کھانا تیار کرواتے دھوتی دُھلاتے، برتن صاف کرواتے اور پھر رات کو بدن دبواتے ہیں اور اس کے علاوہ مجلسوں میں رنڈی اور بھانڈ کے ہمراہ مشعل لئے کھڑا رہنا پڑتا ہے، اسی طرح کمہار سے گھڑے منگوا کر پانی بھروانا کسانوں مثلاً جاٹ، مالی، اہیر وغیرہ سے جب کبھی کسی افسر کا دورہ ہوتا ہے بیل گاڑی، دودھ، دہی، گھی، وغیرہ ضرورت کے مطابق لیا جاتا ہے، ان کی عورتیں بھی بیگار سے بری نہیں رکھی گئی ہیں، ان سے شادی کے ایام میں کئی من آٹا پسوایا جاتا ہے لوہاروں سے اگر کوئی کام نہیں تو یہی سہی کہ قیدیوں کو بیڑی بنانا، اس کو پہنانا اور پھر اُسکو اُتارنا یہ سب کام لئے جاتے ہیں، منیا و نیز گجر لوگ پہرہ پر مقرر کئے جاتے ہیں، جاہل برہمنوں سے باورچی کا کام لیا جاتا ہے اور تعلیم یافتہ پنڈتوں سے رامائن دفتر کا سبق و مطالعہ کرایا جاتا ہے، اسی طرح مہاجن بھی اس بیگار سے بری نہیں مجبوراً ان کو کسی افسر کے دورہ میں رسد بھیجنی پڑتی ہے۔

راجستان میں بہت سی ذاتیں خاص طور سے حابی روشن ذات، جھروکہ اپنے مکان میں نہیں بنوا سکتے وہ خاص طور کی سواری بھی نہیں رکھ سکتے، اگر کسی کا قسمت کا ستارہ بلند ہوا اور وہ فضل الٰہی سے قدرے اس لائق ہوا کہ گھوڑا و گاڑی رکھ سکے تو اس کو اجازت نہیں، ان میں سے بہت سی ذاتیں اچھے زیورات و کپڑے زیب تن نہیں کرسکتی اور بعض تو اپنا نام بھی اچھا نہیں رکھ سکتی، وہ دوران بیاہ و غمی میں خاص قسم کا کھانا بھی نہیں پکوا سکتے، شادی کے ایام میں ہر ایک دُولھا "بیدراجا" کہلاتا ہے لیکن راجہ ہونے پر بھی بیچارہ گھوڑے پر نہیں سوار ہوسکتا، سرغرے یعنی مہتر دھوبیوں کا ذکر ہی کیا اُنکی زندگی کی حالت تو جانوروں سے بھی کہیں خراب ہے، چاندی کے زیورات بھی پہننا ان کے لئے جُرم سمجھا جاتا ہے، لیکن اب کئی ریاستوں میں روشنی کا اثر ہو رہا ہے اور لوگ اپنی غفلت سے بیدار ہو رہے ہیں اور اپنے حقوق زندگی کو سمجھنے لگے ہیں، عدالتوں نے بھی اکثر اس کا فیصلہ کر دیا ہے مثلاً جودھپور کی عدالت نے ایک بار کے فیصلہ میں اجازت دیدی کہ چمار سونے کی ایک لڑی کانوں میں پہن سکتے ہیں، بیگار سے ناجائز فائدہ اُٹھانیوالوں کا تو یہ کہنا ہے کہ بیگار سے بہت سے آرام مثلاً دورہ میں خیمہ گاڑنا، رسد بھیجنا، سواری وغیرہ کا انتظام کرنا یہ سب ہاتھ سے جاتا رہیگا لیکن یہ سب باتیں فضول و یکطرفہ ہیں کیونکہ اگر روپیہ و مزدوری دی جاوے تو ریاست کے غریب سے غریب کو بھی

سامان مل سکتا ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ پوری قیمت
دینے سے زیادہ فائدہ ہوتا ہے اور غریبوں کو بھی
فضول کی پریشانی نہیں اٹھانی پڑتی، کئی ریاستوں
سے بیگار ہٹا دیا گیا ہے اور کہیں پر آدھی یا تہائی
مزدوری دی جانے لگی ہے لیکن شاید یہ غریبوں کے
ہاتھ میں نہ جاکر اہلکاروں کے دست مبارک میں
ہی رہ جاتا ہے اس سے بڑھکر اور کیا افسوس و شرم
کی بات ہوسکتی ہے، اکثر کرایہ کی ہوئی گاڑیوں سے
بیل یا اونٹ سرکاری اسباب اٹھانے کے لئے لیا جاتا
ہے، کھانا وغیرہ کو کون پوچھتا ہے، کام کرنا صرف غرض
رہتی ہے اور چلتے وقت سرخ آنکھیں دکھاکر انھیں
بھگا دیا جاتا ہے، انگریز گورنمنٹ کا خیال کون
اس طرف متوجہ کرے، ہز اکسلنسی کو تیز رو اسپشل ٹرین
کی گاڑی کے صاف و ستھرے گدوں پر لیٹے ہوئے کیا
خبر ہوسکتی ہے کہ کون بیچارہ سردی کے ۱۲ بجے رات کو
ریل کی پٹری کے پاس کھڑا پہرہ دے رہا ہے اور کون
ماہ جون کی دوپہر کو تار کے پاس کھڑا جل رہا ہے۔

ہولی و دیواری و سالگرہ کے روز سب مہاجنوں
کو اکٹھا ہوکر دربار میں مجرا کے لئے حاضر ہونا پڑتا ہے
اور پنچایت کی طرف سے کچھ نذر کرنی پڑتی ہے، دوسری
قوموں کو بھی ایسا ہی کرنا پڑتا ہے، بہت سے
رئیسوں کا برتاؤ اپنی رعایا کے ساتھ بہت ہی
برا ہوا کرتا ہے، جاگیردار کے مکان میں جس کو
کوٹ یا گڑھی بھی کہتے ہیں اور وہ ایک طرح پر
پبلک گھر ہی سمجھنا چاہئے لیکن اُس گڑھ میں یا
یا اس کے قرب و جوار میں کوئی چھاتا لگاکر یا ننگے
سر نہیں نکل سکتا، نہ کرسی پر بیٹھ سکتا ہے نہ شب
تاریک میں آگے روشنی لیکر چل سکتا ہے اور نہ چارپائی
پر سو سکتا ہے، نشست و برخاست کا طرز تو یہ ہے
کہ آپ گدی لگاکر بیٹھتے ہیں اور دوسروں کو کھڑا رہنا
آفت و گستاخی ہے، راجپوتانہ کی رعایا کو وہ دن باعث
ناز ہوگا کہ جس روز ہر ریاست سے یہ رسم جاتی رہیگی۔
بیگار کے علاوہ ان لوگوں سے بہت قسم کے محصول
بھی لئے جاتے ہیں، مثال کی طور پر ایک لکھے دیتے ہیں۔

کوئی جاگیردار اپنی گھوڑی کو گاؤں کے چاروں
طرف دوڑا رہا تھا، دفعتاً ایک چٹان پر بنے ہوئے
چبوترے پر ٹھوکر کھاکر زمین پر گر پڑے، گھوڑی چٹان
پر گرنے کے باعث فوراً ہی مر گئی، اس سانحہ کی
خبر سنکر گاؤں کے بہت سے لوگ جمع ہوگئے، ٹھاکر صاحب
کو بھی سخت چوٹ آئی تھی، سنبھلنے پر بھی منہ سے آہ
نکل ہی جاتی تھی، لوگوں نے سمجھا گھوڑی کے مرجانے
کا ٹھاکر صاحب کو بہت افسوس ہو رہا ہے، لہذا
سب ملکر سمجھانے لگے لیکن اگر گھوڑی کا رنج ہو تب
تو سمجھ میں آوے، یہاں تو کوئی دوسری ہی بات تھی
آخر کار کچھ امیر مہاجنوں نے کہا کہ آپ اتنا افسوس
کیوں کرتے ہیں، آج ہی اسی طرح کی ایک دوسری
گھوڑی خرید کر لیجئے، ٹھاکر نے کہا اتنے روپے
کہاں ہیں، لوگوں نے جوش میں آکر کہا کہ ہم لوگ
دیدینگے، بس پھر کیا تھا مبلغ ۵۰۰ روپیہ میں اسی
روز ایک گھوڑی خریدی گئی اور گاؤں کے لوگوں

نے اس اُمید پر ۵۰۰ روپیہ اکٹھا کر دئے کہ تحصیل وصول کے وقت مجرا مل جائیگا لیکن لگان وصول کرتے وقت ٹھاکر نے کہا کہ تمھارے گاؤں کے چاروں طرف دوڑتے ہوئے ہماری گھوڑی مری لہذا اس کی قیمت تم کو دینا ہوگی، سال بھر گذر جانے پر ٹھاکر صاحب کے ضلعدار نے "گھوڑ بڑی" یعنی گھوڑی کی قیمت پھر مانگی، رعایا شکایت لیکر ٹھاکر صاحب کے پاس پہنچی، جاگیردار نے فرمایا کہ "میری وہ گھوڑی ہر سال پانچسو روپیہ کی قیمت کا ایک بچہ دیتی تھی اس لئے تمھیں اُس کا نقصان بھگتنا ہوگا، اگر سیدھے سے نہیں دوگے تو پھر تمھارے لئے ہتکڑی تیار ہے، آخر کار مبلغ ۵۰۰ روپیہ کی رقم کسانوں کو بطور اضافہ لگان دینا ہی پڑا اور وہ رقم آج تک وصول کی جاتی ہے، اسی طرح اگر کسی رئیس کے یہاں شادی و غمی میں رعایا کو "نیوتا" یعنی دعوت کے عوض میں کچھ نہ کچھ نچھاور کرنا پڑتا ہے، وقت پڑنے پر اُن کی مصیبت میں کوئی رئیس مدد نہیں کرتا، زمین کے فروخت یا بیع ہو جانے پر تو نذرانہ کا کوئی ٹھکانا ہی نہیں، برطانیہ ہندوستان میں جہاں ۱½ فی صدی مجرانہ دینا پڑتا ہے ریاستوں میں ۱۰ فی صدی اور کہیں کہیں ۳۳ فی صدی تک مجرانہ دینا پڑتا ہے، چھوٹا جاگیردار بھی مجرانہ لیا کرتا ہے، اتنا زیادہ لگان وصول کرنے پر بھی ریاست میں رعایا کی بہتری کے لئے کوئی کام نہیں کیا جاتا۔

محصول و بیگار کی طرح اور بھی ایک رسم راجستان میں اب تک جاری ہے، وہ رسم ہے غلامی، گو کہ دُنیا کے صفحہ ہستی سے ۲۸ اگست ۱۸۳۳ء کو غلامی اُٹھا دی گئی لیکن یہاں پر ابھی اس کا ڈنکا بج رہا ہے، یہاں پر بیسویں صدی میں ۱۶۱۷۳۵ مرد و عورت کی تعداد غلامی کا طوق پہنے ہوئے ہے، ہر ریاست میں ان کا جُدا گانہ نام ہے مثلاً داروغہ، چاکر، حضوری، راون، خواص وغیرہ وغیرہ، ان کی بہن بیٹیاں بھی شادی کے جہیز میں اکثر دیگر اسباب و سامان کی طرح دیدی جاتی ہیں، صرف یہیں تک نہیں، یہ خرید و فروخت بھی کی جاسکتی ہیں، اگر سبحان اللہ کوئی حسین ہوئی تو اسکو پاسبان بھی بنا لیا کرتے ہیں، انکی شادی صرف نام چار کے لئے ہو جاتی ہے، اصل میں یہ ملکیت کسی دوسرے کی ہوتی ہیں، انھیں غلیظ سے غلیظ کام کرنا پڑتا ہے اور ان کے کھانے و پہننے کے لئے بہت ہی خراب کھانا و لباس دیا جاتا ہے، اپنے آقاؤں کی خدمت میں انکو شب و روز حاضر رہنا پڑتا ہے، اگر معمولی بھی خطا ہو جائے تو بس مار پیٹ کی نوبت آجاتی ہے، حالت اس قدر ابتر ہوگئی ہے کہ نہ تو وہ اس سے بڑی ہونے کی کوشش کرتے ہیں اور نہ ہو بھی سکتا ہے، جو لوگ ریاستوں کے ظلم و تعدی سے فرار ہو کر انگریزی گورنمنٹ کے زیر سایہ پناہ لیتے ہیں اُنکو کسی نہ کسی جرم کا سزاوار قرار دیکر پھر اُسی جگہ پکڑوا منگاتے ہیں انکی حالت تو واقعی پھر قابل رحم ہوتی ہے

انگریزی حکمران و افسران انکو جو انگی مجان ملک غیر کے قانون کی آڑ میں اُن کو مالک کے حوالہ کر دیتے ہیں، اسکا اس قدر گہرا اثر ہوا ہے کہ وہ کبھی اس غلامی کو آزادی پر ترجیح نہیں دیتے اور فطرتاً اس قسم کی زندگی کے عادی ہوگئے ہیں، ادھر مالکوں کو اپنے خودغرضی کی دُھن میں انکی حالت پر بہت کم غور کرنے کا موقع ملتا ہے، موجودہ روشنی کے جاگیردار کبھی کبھی اکثر دوران گفتگو و مضامین لکھنے کے وقت غلامی کی بُرائی کر دیا کرتے ہیں لیکن اب کچھ اُمید کی شعائیں دکھائی دیتی ہیں کیونکہ مہاراج نیپال نے جب ۱۹۲۶ء سے اپنے ملک سے غلامی کی رسم کی بیخکنی کی تب سے بہت سے حکمران ریاست نے اس سے سبق سیکھا اور جوش میں آکر اس کے لئے قانون اجرا کرائے ہیں، مہاراج جودھپور نے ۱۹۱۶ء کا غلامی کا قانون مورخہ ۱۲ر اپریل ۱۹۲۶ء کو ردّ اعلان کر دیا۔

اس قانون سے یہ فائدہ ہوا کہ کوئی جاگیردار یا رئیس کسی داروغہ مرد یا عورت سے بغیر اس کی مرضی کام نہیں کرواسکتے، اگر نوکر کا من چاہے تو وہ کام کرے ورنہ کوئی زبردستی نہیں کرسکتا، اب لونڈیاں جہیز میں بطور اسباب کے نہیں دی جاسکتی، ہم لوگوں کو ایسے مہاراج کو شکریہ اور مبارکباد دینا چاہئے اور اُمید قوی ہے کہ قرب و جوار کے جاگیردار و نیز راجا اس مثال کو معراج آزادی کی سمجھکر زمانہ کی روش کے مطابق اپنی رعایا کو آزادی بخشینگے یہ فرض کر لینا کہ دبی ہوئی رعایا و مظلوم کسانوں کے ساتھ انصاف کا برتاؤ ہوگا بعید یقین معلوم ہوتا ہے، جس کی لاٹھی اُس کی بھینس کا قصہ ہے، عدالتوں میں اکثر قانون اس طرح سے ادا کیا جاتا ہے کہ راست دروغ و دروغ راست بن جاتا ہے تب پھر ایسی انصاف کی جگہ میں جو زوردار و باثر آدمی ہیں اُن کے خلاف بھلا کیا کوئی غریب مفلس انگشت نما ہوسکتا ہے، ترقی شدہ ریاستوں میں ایک نہایت ہی سادے مقدمہ میں کئی برس صرف ہوجاتے ہیں، سیکڑوں مثلیں زیر تجویز رہتی ہیں، پیچیدہ مقدمات میں تو اکثر ایک آدھ پیڑھی گذرجاتی ہے، ایک پُرلطف قصہ مشہور ہے، کسی ریاست میں ایک بار جنگل میں آگ لگ گئی، لوگوں نے شکایت کی درخواست کی، تین برس کے بعد حکم ہوا آگ بجھا دیجائے، ناظرین خود خیال کرسکتے ہیں کہ عدالتوں کا کس طور پر انتظام ہوا کرتا ہے، کئی ریاستوں میں اونچے و اعلیٰ اہلکاروں میں غالب آنے کے لئے فریقین بڑی تیاریاں کرتے ہیں اور جو اُن میں سے زوردار ہوتا ہے وہ اپنے مخالفین و نیز اُنکے ساتھیوں کو ایذا پہنچانے کی دل و جان لگاکر سعی کرتے ہیں، اسی طرح اپنے خلاف خیال کرنے والے کو یا جو اپنی رائے سے موافقت نہیں کرتا اُسکے اوپر جھوٹے مقدمہ قائم کئے جاتے ہیں اور اس کو ہر طرف سے مغلوب کرنے کی کوشش و تدبیر کی جاتی ہے، یہاں کے ہر ایک معاملہ میں کورٹ فی و اسٹامپ فی بہت بڑھی ہوئی ہے۔

قومی و اخلاقی بڑی رسموں کو دُرست کرنا جب ہی ممکن ہوسکتا ہے کہ جب راجا و رعایا دونوں اس پر کمر باندھ لیں لیکن یہاں پر ایک نرالا ہی ڈھنگ دکھائی دیتا ہے، یہاں کا قریب قریب ہر ایک رئیس شرابخواری و بدمعاشی میں مبتلا ہے، کیونکہ زیادہ تر اپنے مالک تو ہوتے ہی ہیں اور اگر کہیں خدا پناہ انھیں جوڈیشل و سول اختیار بھی دیدئے گئے تو بس وہی مثال سامنے ہو گی "ایک تو کریلا دوسرے نیم چڑھا" یعنی ایک تو خدا کے فضل سے یوں ہی رات کو دن کہتے ہیں اس اختیار سے تو اور بھی جُرأت بڑھ جائیگی، خدمتگار و ملازمین تو خوشامد کرکرکے اور بھی سونے میں سُہاگا کا کام کرینگے اور اگر کسی نے کبھی خواب میں اپیل کی سوچی تو جاگیردار خوب ہی موقع پانے پر بدلا نکالتا ہے، اگر ان سب کارروائیوں کا معائنہ و تفتیش ہوتی رہتی تو ذرا غنیمت بھی تھی لیکن وہ بھی نہیں ہوتا نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ جاگیرداروں کی رعایا کو ریاست کی رعایا سے زیادہ ظلم سہنا پڑتا ہے جاگیرداروں کو تنگدست رعایا سے من مانا لگان و بیگار لینے میں اور اُس زر کو عیاشی میں صرف کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں، مناسب تو یہ ہو گا کہ ریاست اپنی ہر جاگیر میں ایک پنچایت مقرر کرے کہ جو آمد و خرچ کا ایک بجٹ تیار کرے اور اُسی کے مطابق سال بھر اخراجات کئے جاویں۔

کاش فضل الٰہی سے ریاست کے کوئی شاہزادہ یا کنور صاحب کالجوں میں تعلیم پاگئے تو وہ سوٹ، موٹر، پولو و شکار سے دم نہیں مارتے، رعایا کی بہبودی کا کیا خیال کریں، اُمورات ریاست و اُن کے انتظام سے وہ اسی طرح بے بہرہ رہتے ہیں جیسے گھاس کاٹنے والا قلم سے اور اکثر موجودہ انگریزی روشنی اس قدر اثر کرجاتی ہے کہ وہ ہند و ذات کے معراج و وصول دماغ سے فراموش ہوجاتے ہیں اور اُن کی جگہ مغربی فیشن قبضہ جما بیٹھتا ہے۔

وہاں کی تعلیم کے سلسلہ میں کوئی بھی ایسی بات نہیں ملتی جس سے کہ راجپوتی جھلک دکھائی دے کتنے راجپوت، راجکمار لاٹھی تلوار کا استعمال جانتے ہیں؟ اور ان میں سے کتنے چال چلن کے معقول و راستی سے رہتے ہیں؟ کتنے اور لوگوں کی طرح جہاز و ریل میں کونڈ جھونک کر اپنے نازک بدن کو سخت و برداشت کے قابل بنایا ہے؟ حقیقت تو یہ ہے کہ یہاں پر وہ صرف کلبوں کا ممبر ہونا سیکھ جاتے ہیں اور دین و دنیا کی پھر کیا خبر۔ مہاراج گوالیار نے اپنی رپورٹ ۱۹۱۱ء تا ۱۹۱۲ء میں فرمایا ہے:- جاگیردار دربار کے خوبصورت نور ہیں۔ ہماری تدبیر تو یہ ہونا چاہئے کہ یہ لوگ رعایا و عوام الناس کی شرکت میں کام کریں اس سے یوروپ میں کیسی ترقی ہوئی ہے، ایسی تعلیم کے اثر سے حکمراں و محکوم کے درمیان ایک دیوار کھڑی ہو جاتی ہے، انگلینڈ کے شاہی خاندان کے لوگ و خود پرنس آف ویلس آکسفورڈ

و کیمبرج کالجوں میں پڑھنا اپنے خلاف شان نہیں سمجھتے، تب ہمارے یہ چھوٹے موٹے راجاؤں کو کسی خاص کالج میں جانے کی کیا خاص ضرورت ہے، شاہی خاندان کے لوگوں کو معمولی آدمیوں کی صحبت میں رکھ بہت سی باتیں سیکھنے کا موقع ملتا ہے، اگر رعایا کے لڑکوں کے ساتھ تعلیم پاکر بڑے ہونگے تو اُنکے حالات سے اُنکو واقعی آگاہی ہوگی اور اُنکے رنج وغم کے شریک بنیں گے اور جب عنانِ سلطنت دستِ مبارک میں لیں گے تو آسانی سے غریبوں کے حال کو سمجھ سکیں گے اور انصاف بھی دُرست و جا ہوسکیگا اُنکے حالات وکیفیت سے ہمدردی ہوگی، یہ سب باتیں اجمیر کے کالج میں حاصل نہیں ہوسکتیں، لہٰذا شاہی خاندان کے بچوں کی تعلیم معمولی کالجوں میں ہونا چاہئے۔

اس لئے گوالیار کے مہاراج ہز ہائینس سر رام سنگھ بہادر۔ کے۔ سی۔ آئی۔ ئی نے رواج کے خلاف اپنے لڑکوں پبلک کالجوں میں تعلیم دلائی ہے اور وہاں کے ہونہار بڑے مہاراج کمار پرنس رگھوبیر سنگھ گذشتہ سال الہ آباد یونیورسٹی سے گریجویٹ ہوئے ہیں۔

لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ زیادہ تر دیسی راجا خواہ جاہل خواہ تعلیم یافتہ سب کے سب موج کرنا وعیاشی میں وقت گذارنا ہی اپنی زندگی کا خاص مقصد سمجھتے ہیں، خلاف قدرت کام کرنا تو گویا اُنھوں نے اپنے لئے مخصوص کرلیا ہے، تمام شب ناچ وگانے میں گذرتی اور تمام دن سوتے میں، ولایت کی سیر، پیرس کے ناچ گھروں میں وہ مستی وچہل وموٹر کی سفروسیاحت ہی سے اُنکا جی نہیں گھبراتا تو ریاست میں تعلیم وانتظام کا بندوبست کیا خاک ہو، رعایا کی مفلسی پر غور کرکے اخراجات ذاتی دن دونا رات چوگنا بڑھتے جارہے ہیں جنکی دستیابی کے لئے رعایا پر نئے نئے طریقوں سے لگان ومحصول لگایا جاتا ہے، ان کا دھیان واقعی ترقی وتعلیم کی زیادتی کی طرف کیسے مائل ہوسکتا ہے وہ تو احاطۂ انسانیت کے باہر قدم رکھ چکے ہیں، وہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اور عبرت لینا نہیں سیکھتے کہ روس سلطنت کا زار شہنشاہ اپنے ظالمانہ برتاؤ کی بدولت رعایا کے ہاتھ سے کس منہ کی کھائی، فرانس کا لوئی چودھواں کس طرح سے دورانِ فرانسیسی انقلاب میں کس سزا کا مرتکب ہوا، ونیز ٹرکی کے ہردلعزیز کمال پاشا نے کس طرح سلطان مذکور کو نکال باہر کیا۔ یہ بھی سُنکر کان نہیں کھڑے ہوتے، کل جو اسلام کا خلیفہ تھا، مسلمانوں کا تاج وجاے ناز تھا، جسکے اشارے پر تمام دُنیا کے مسلمان جہاد (مذہبی جنگ) کرکے دُنیا میں خون کی ندی بہادیتے تھے وہی آج زمانہ کی گردش سے محلات کے عیش وآرام کو ترک کرکے اپنی عزیزہ سے علٰحدہ ہوکر جزیرہ مالٹا میں پناہ گزیں شبِ تاریک میں تنہا اپنی گھڑیاں گن رہے ہیں، لیکن ان سب زوال کی وجہ کیا تھی؟ جواب پادشاہوں کی

خود مختار و آزاد و آوارہ مزاجی، سلطان اسی کے
باعث مسلمانوں سے ہمدردی کھو بیٹھا، اُس نے
رعایا کی حالت پر توجہ نہ کی، رعایا کی بات کو اُس نے
پیروں سے ٹھکرایا، لہذا ریاست کے راجاؤں کو
تواریخ کے صفحہ سے نصیحت حاصل کرنا و سبق سیکھنا
چاہئے پھر بھی یہ صبر و تسلی کی بات ہے کہ کچھ راجاؤں
نے اپنی ریاست کے قوانین رعایا کی رائے سے بنایا
ہے، مہاراج بیکانیر سر گنگا سنگھ بہادر نے اپنے یہاں
ایک لیجسلیٹو کونسل یعنی رعایا کی ایک مجلس قائم
کی ہے لیکن ابھی اسکی طاقت بہت کم ہے، ایجیٹیشن
سے بھی طرح طرح کی راج سبھائیں و رعایا کی مجلسیں
قائم ہونے کی اُمید ہے، دیشی حکمراں کا دھیان
اب زمانہ کی تبدیلیات سے ضرور رعایا کی فارغ البالی
و بہبودی کی طرف جھکیگا۔

راجپوتانہ کے مذہبی وصول و خیالات کے
متعلق صرف یہی کہنا ہے کہ زیادہ تر لوگ اندھے ایمان
و جادو ٹونا میں گرفتار حال ہیں، البتہ کہیں کہیں کچھ
کچھ شعاع روشنی و دانشمندی نظر آتی ہے، اس کا فخر
آریہ سماج کو ہونا چاہئے کہ جس نے ہندو ذات کی
ترقی کے لئے کتنی مصیبتوں کا سامنا کیا ہے اور
کر رہے ہیں، اُس کے اثر سے بہت سی ریاستوں
میں لوگ اپنی غلط فہمی کے خیالات سے برامند
و چھٹکارا پاسکے ہیں اور نجات کا سیدھا راستہ
دیکھ لیا ہے، واقعی میں جو فائدہ کہ سوامی دیانند
نے اپنی گفتگو و لکچر و مضامین سے ریاستوں کو پہنچایا
ہے وہ کبھی ذہن سے فراموش نہیں کیا جاسکتا کیونکہ
سوامی جی نے اپنے ذاتی تجربہ سے اس بات کی خوب
تحقیق کر لی تھی کہ جس طرف بڑے و پر اثر لوگ چلتے
ہیں اسی طرف پبلک بھی رُخ کرتی ہے، اسی وجہ
سے وہ راجپوتانہ میں خوب اثر ڈالنے کی ٹھانی
تھی لیکن جس ملک کی خیر خواہی و بھلائی کے
لئے سوامی جی تُلے ہوئے تھے وہی زمین اُنکے
موت کی باعث ہوئی، بغض و دشمنی کی آگ
سے جلتے ہوئے دشمنوں کے دل نے آخر کار اُنکو
جودھپور میں کھانے کے ساتھ زہر کھلا ہی دیا،
اور جو کچھ نہ ہوتا تھا وہ ہوگیا، اس خون کے
عوض کا صرف ایک راستہ ہے اور وہ یہ ہے کہ
راجپوتانہ کی ریاستیں سوامی جی کے تبلائے ہوئے
اُصولوں پر مضبوطی سے قدم رکھکر اُس مرکز کو
فتح کریں جو کہ مرحوم نے معراج تبلایا ہے، راجپوتانہ
میں جو کچھ بھی سدھار آج نظر آتا ہے وہ سوامی جی
کی بنیاد کا انجام ہے، خلاصہ و مختصر یہ ہے کہ
راجپوتانہ کی حالت ابھی بہت کچھ سدھار کے
قابل ہے، کئی قوتیں اور کئی اثرات علٰحدہ علٰحدہ
طور پر کام کر رہے ہیں، جس طرح پران دنوں
انگریزی حکومت میں ڈانواڈول ہے اسی طرح
راجپوتانہ میں قومی حالت بھی قابل تبدیلی ہے
سیاست کے معاملات کا تو اس جگہ ذکر ہی کیا
ہے جہاں ریاستوں میں اب بھی تھانہ اور تحصیل
نیلام کی جاتی ہے اور زبان اہلکاران اُس جگہ

شادی کے پہلے

شادی کے بعد

FINE ART PRINTING COTTAGE ALLAHABAD

کا قانون ہے، جس آدمی کو جس قصور یا جس جرم میں
چاہیں پھنسا دیں اور یہ سب وہاں کی معمولی باتوں
میں سے ہے، ایسے ہی وہاں کے مہاراجاؤں و انکے
وزرا کی کیفیت ہے، جس کو جب خواہش ہو مجرم
قرار دیں، جس سزا کا مرتکب سمجھیں وہ بغیر خطا ہی
اُسکو دیدیں، خود ہی مقدمہ تیار کریں اور خود ہی
اس کا فیصلہ کریں اور خود ہی جیلخانہ روانہ کریں
یہ سب بائیں ہاتھ کا کام ہے، مجال ہے کہ کوئی
چوں کرے، جسکی شامت آئی ہو وہ اُنگلی اُٹھائے
مہاراجاؤں کے فرائض و اختیارات کی کیا انتہا،
لیکن موجودہ وقت میں مہاراجہ مرحوم گوالیار و جودھپور
وجھالاواڑ ریاست کے مہاراجہ نے اب اہلکار اُنکے
خلاف سازش رعایا کی شکایتوں پر دھیان دینے
لگے ہیں اور ایسا کرنے سے اُنکی راہ میں کوئی دقت
پیش ہوتے نہیں سُنی گئی، بلکہ ان ریاستوں کے
مہاراج اپنی معمولی رعایا سے بھی مل جُل لیتے ہیں
اور تب بھی اسی طرح حکومت اور رعب قائم رہتا
ہے اور وہی عزت بلکہ زیادہ ہر دلعزیز ہوگئے ہیں
اور ملازمین ریاست کے ظلم میں کمی ہونے لگی ہے
لیکن ابھی بہت سی ریاستیں ہیں جو بیسویں صدی
کی فضا کی بہار لوٹ رہی ہیں، رعایا اندھے کی
لاٹھی سے ہانکی جاتی ہے اور اتنا ہی صبر کیا کم ہے
کہ سودیشی راج کے باشندے ہیں لیکن رعایا جو
اب تک محو خواب غفلت رہی ہے اب جاگ رہی
ہے اور یہ ترقی اسی جگہ تک پابند نہیں رہیگی
بلکہ بالضرور زمانہ گذرنے پر دیگر صورت اختیار کریگی
اور جیسا کہ سنٹرل انڈیا ایجنسی کے ایجنٹ گورنر جنرل
آنریبل مسٹر سول صاحب نے فرمایا ہے وہ الہام
کی طرح سچ ثابت ہوگا ۔

"اب ریاستیں علٰحدہ نہیں رہ سکتیں، انگریزی
ہندوستان میں جو ترقیات یا سیاست کے معاملات
میں تبدیلیاں واقع ہو رہی ہیں اس کی ہوا
وہاں بھی ضرور پہنچیگی، اب تک مہاراجاؤں کی
من مانی حکومت تھی، کوئی ان کے احکام سے
معترض نہیں ہوسکتا تھا لیکن اب وہ وقت نزدیک
ہے کہ جب راجاؤں کو اپنے کام و کارروائی کا جوابدہ
رعایا کے رُوبرُو بننا پڑیگا، اُن کو اگر اپنی بھلائی منظور
ہو تو ان کے رہنما بنیں، انھیں سدھار کر راہ راست
پر لاویں اور رفتہ رفتہ اُن کو زیادہ اپنے راز کے
رازداں بناویں ۔"

کس مسرت کا موقع ہے کہ کرنیل صاحب کی
مستقبل کے الہام سچ ہوتے ہوئے دکھلائی دے رہے
ہیں، اب وہ سمجھنے لگے ہیں کہ راجاؤں کی بھلائی
رعایا کی فارغ البالی پر منحصر ہے، اخیر میں ہماری
یہی خداوند سے آرزو و دلی دعا ہے کہ ایک نہ ایک
روز آنے والے دنوں میں راجپوتانہ کو وہی فخر
و شوکت نصیب ہو اور اُسکے حکمراں مانند
سری رامچندر جی ایسے ہونگے جنکے سایہ حکومت
میں رعایا چین کی بانسری بجائیگی اور ہر طرف
صلح و امن کا تسلط ہوگا، رعایا و راجا میں کوئی

شکایت نہ رہ جائیگی، ایسی حالت کا پیدا کرنا رعیت اور راجا دونوں کا فرض ہے لیکن راجا اسکے زیادہ جوابدہ و ذمہ دار ہیں، وہ دن اب دور نہیں ہے کہ جب ؎

تنے گا مسرت کا پھر شامیانہ
بجے گا محبّت کا نقار خانہ

قصہ مختصر یہ کہ وہاں کوئی مقررہ قانون نہیں، وقت کے حساب سے قانون کی کارروائی ہوتی ہے ایک ہی گستاخی ایک وقت میں مہاراجہ کی طرف سے قابل جُرم قرار دیجاتی ہے اور دوسرے وقت قابل انعام سمجھی جاتی ہے، اکثر دیکھا گیا ہے کہ جن قصور پر رعایا کو سخت سزاؤں کا فیصلہ کیا گیا ہے وہی جُرم اہلکاروں نے کیا اور صاف عدالت سے رہا کر دئے گئے، اُنکی سفارش ہی عدالتوں کا فیصلہ تبدیل کر دیتی ہے، رعایا اپنی زندگی کے ازل ہی سے اپنے حقوق سے بے بہرہ رکھی جاتی ہے اور چند جو اِن سب ظلم کو سمجھتے بھی ہیں وہ افسروں کے ڈر سے صم و بکم بنے رہتے ہیں لیکن رفتہ رفتہ لوگوں میں روحانی ترقی بڑھ رہی ہے وے اپنے حقوق خوب سمجھنے لگے ہیں، اپنے حقوق کے لئے سزا پانا جیلخانہ جانا اسکو ناگوار نہیں سمجھتے، ہنومان کو سیتا دیوی کی جستجو میں جانا اور لنکا میں راکھسوں و بدمعاشوں کے جال میں گرفتار ہوکر طرح طرح کی ایذائیں سہنا بھی ظاہر کرتا ہے کہ ہمیشہ سے ظالموں کے ہاتھ سے غریبوں و انصاف پسند لوگوں کو تکلیفیں ملتی رہی ہیں، اگر گناہ کی سزا بھگتنے کے لئے جیلخانہ جانا ہو تو وہ مثل جہنم کے ہے ولیکن اگر دوسروں کی بھلائی و راستی کے حق میں قیدی بننا ہو تو وہ جنت کے مزوں سے بڑھکر ہے، کہا گیا ہے۔

پتھر کی دیواروں سے قیدخانہ بنتا نہیں
لوہے کے شکنجوں سے پنجر رکتا کہیں؟ ؎
دوش رہت شانت بکیت مانتے
بندی گرہ کو تپو بھوم جانکے

(یعنی جو قصور و خطا سے مبّرا ہیں وہ جیلخانہ کو عبادت گاہ تصور کرتے ہیں) بیشک ملکی و قومی محبت ہر فرد بشر کا فرض ہے اور اگر اس فرض کے انجام دینے میں ایذاؤں کو برداشت کرنا پڑے تو وہ تکلیف نہیں بلکہ آرام کہلائیگی۔

ادھر پبلک کی رسائی اپنے قضا و قدر کے حکمراں تک نہیں ہوتی، جس سے وہ اپنے غم کا افسانہ و شکایت کا دفتر کھول سکیں، اسکی وجہ یہ ہے کہ خوشامدی بے ایمان اہلکار ہر وقت مہاراج صاحب سے کہتے رہتے ہیں کہ "عالیجناب آپ کہاں تک شکایت پہ دھیان دے سکینگے اور ایسا کرنے سے حکومت میں فرق آجائیگا اور رعب جاتا رہیگا۔

لڑکی اور طوطا

(جناب کرشن سہائے صاحب ہنکاری وکیل)

میرے طوطے اے مری آنکھوں کے تارے میرے لال
کیا بتاؤں میں کہ کیا دُکھ کی کہانی تھی تری
چھوٹ کر ماں باپ سے اپنے نہ جانے تُو کہاں
میرے گھر آیا تھا تو جب کنٹھ بھی پھوٹا نہ تھا
تیرے جینے کی کوئی صُورت نظر آتی نہ تھی
آہ! کتنے ناز سے ہاتھوں پہ پالا تھا تجھے
گنتے گنتے وہ بھی دن آیا ترا نامِ خدا
بچپنے کا رنگ تیرا مائلِ پرواز تھا
نام لیکر وہ ترا مجکو بُلانا یاد ہے
آہ! وہ اِک پہر سے شب بھر کھڑا رہنا ترا
نور کے تڑکے ہی سب گھر کو جگا دینا ترا
کیا ہوا طوطے بتا کچھ رات تجکو کیا ہوا
کیا مری خدمت کا آخر وقت تک احساس تھا
نزع کی تکلیف سے یا ہو کے اکدم بدحواس
وائے قسمت مجھ پہ گہری نیند کا غلبہ رہا
یہ تو سچ ہے کچھ نہ کر سکتی تھی میں اُٹھکر ترا
شکریہ محسن کا اپنے یُوں ادا تُو کر گیا
یہ تو مانا تُو جہاں میں آشیاں برباد تھا

کس طرح دل سے مٹاؤں تیری صورت کا خیال
سر بسر تصویر حسرت زندگانی تھی تری
پھنس گیا تھا دام میں صیّاد کے یُوں ناگہاں
اُف پروں سے بھی تو لاسے کا نشاں چھوٹا نہ تھا
ایک دم کو بھی میں تیرے پاس سے جاتی نہ تھی
آہ! کتنے پیار سے برسوں کھلایا تھا تجھے
جب قفس میں تُو پروں کو تولکر پھرنے لگا
تیرے ہر لہجہ میں گویائی کا اِک انداز تھا
اور چارہ کے لئے پر پھڑ پھڑانا یاد ہے
دے رہا ہے مجکو اب تیری عبادت کا پتا
نام لے لے کر "اُٹھو" کی رٹ لگا دینا ترا
نام میرا لیکے اس دُنیا سے تُو کیوں چل بسا
اس لئے تیری زباں پر نام میرا آ گیا
اپنے محسن کو بُلانا چاہتا تھا اپنے پاس
تیری جانِ ناتواں پر موت کا حملہ رہا
دیکھ لیتی وقتِ آخر تجکو یہ ارمان تھا
اب میں سمجھی نام میرا لیکے تُو کیوں مر گیا
تیرے دم سے یہ قفس میرا مگر آباد تھا

اب نہ جانے کس چمن میں آہ ڈیرا ہے ترا — سُنتی ہوں طُوبیٰ کی شاخوں پر بسیرا ہے ترا
چھوٹ کر قیدِ عناصر سے تو اب آزاد ہے — اب نہ فکرِ آشیاں نے برق نے صیّاد ہے
کاش قیدِ عنصری سے میں بھی اب آزاد ہوں — جس چمن میں تو بسا ہے بس وہیں آباد ہوں
نزع کی حالت میں میرا بھی یوں ہی انجام ہو — کاش میرے لب پہ بھی محسن کا میرے نام ہو
گو کہ دیدار اُس کا وقتِ آخری دُشوار ہے — لب پہ اُس کا نام آجائے تو بیڑا پار ہے

موت ہی وحشی جہاں میں قاطع آلام ہے
حد سے بڑھنا درد کا آرام کا پیغام ہے

خاص

کلکتہ کا عظیم الشان کرسمس ڈے

[جناب حبیب اللہ خان صاحب]

زمانے میں خوشی کا دور ہے عشرت کا ساماں ہے
برنگ گل ہر اک باغ جہاں میں آج خنداں ہے

بڑے دن کی خوشی جیسی کہ کلکتہ میں منائی جاتی ہے ہندوستان کے اور کسی حصہ میں ایسی خوشی نہیں ہوتی، تھیٹر، بائسکوپ، گھوڑدوڑ وغیرہ کے علاوہ مختلف کھیل تماشوں میں ایک قسم کی خاص امتیازی شان پیدا کی جاتی ہے اور عام طور پر دلچسپی کے اسباب مہیا کئے جاتے ہیں، انگریزی ناچ گانے اور دعوتوں کا سلسلہ ایک عرصہ تک جاری رہتا ہے اگر ان ایام میں کیسا ہی غمگین انسان تفریح طبع کی خاطر وہاں پہنچ جائے تو ہم وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ وہ ایک سکنڈ کے لئے بھی پریشان اور ملول نہیں رہ سکتا۔

عیسائی نقطۂ خیال سے یہ وہ مبارک دن ہے کہ جسکی نظیر مل ہی نہیں سکتی، ہم چونکہ ایک مدت سے ۲۵ دسمبر کی شان وشوکت خصوصیت کے ساتھ کلکتہ جیسے عظیم الشان شہر میں قصہ کے طور پر سنتے چلے آتے تھے، اس لئے بڑے دن کے موقع پر اپنے ایک دوست کی ہمراہی میں کلکتہ پہنچ گئے، گو یہاں کے مفصل حالات لکھنے کے لئے ایک بڑے وقت کی ضرورت ہے لیکن مختصر طور پر یہاں کی تفریح کا نقشہ بالکل سچی اور اصلی حالت میں پیش کرتے ہیں۔

آفتاب عالمتاب کے غروب ہوجانے کے بعد چراغاں اور خصوصیت کے ساتھ آتشبازی کی دلفریبیاں ایک ایسا منظر تھا جسکی کیفیت سُنئے اور غور سے سُنئے۔

تماشائیوں کا اژدحام سمندر کے کنارے اس درجہ واقع تھا کہ محاسب عقل کو بھی جسکے شمار میں مغالطہ ہوجانا غیر قرین قیاس نہ تھا بالون کا یہ عالم کہ گویا نشانہ انداز قضا وقدر نے تو دہ فلک الافلاک کو آماجگاہ ناوک آتشیں بنایا تھا یا فیلبان گیتی نے فیل مست گردون گرد ان کی مستی اتارنے

(بقیہ مضمون ۱۹۴ پر دیکھئے)

نظارۂ کشمیر

[خانصاحب محمود علی خان صاحب]

(۱)

مبارک خطۂ کشمیر تجکو شعلہ افشانی　　مبارک جنتِ ارضی تجھے یہ سازوسامانی
بڑھاتی ہے ہر اک سیاح کی آنکھوں میں حیرانی　　ہر اک ذرے میں تیرے بجلیوں کی ہے فراوانی
تجھے آغوش میں پالا ہے خود فیاضِ فطرت نے　　سنہرا رنگ تیرے رُخ پہ پھیرا دستِ قدرت نے
ہم ایسے مشرقی کیا جو کہ تجھ سے فیض پاتے ہیں　　تری محفل میں صدہا مغربی سیاح آتے ہیں
جو خواہش ہو کسی کی حسنِ عالمگیر کو دیکھے　　دل اپنا تھام کر وہ خطۂ کشمیر کو دیکھے
نہیں دیکھا ہے جس نے آنکھ سے عہدِ جہانگیری　　وہ دیکھے آ کے شالا مار میں اب بزمِ کشمیری
جہاں رنگین ہو جاتی ہے صبح و شام کی دُنیا　　وہاں باقی فقط ہے اب اُسی کے نام کی دُنیا
جہاں پر زور گھٹ جاتا تھا ذوقِ حکمرانی کا　　جہاں پر نشہ بڑھتا تھا شرابِ نوجوانی کا
جہاں پر مدتوں بچھتے رہے تارِ نظر اس کے　　جہاں پر اب بھی باقی ہیں نشانِ رہگذر اس کے
یہی وہ ملک ہے جس نے تجمل اسکا دیکھا ہے　　یہی وہ ہے نہیں جس نے تنزل اسکا دیکھا ہے
مگر اے خطۂ کشمیر صدقے تیری اُلفت کے　　کئے ساماں اکٹھا تو نے صدہا ایسی راحت کے
چلے آتے ہیں صدہا دوسرے ملکوں سے شیدائی　　نہیں معلوم تُو نے کونسی وہ رُوح ہے پھونکی
پئے جاتے ہیں پیہم جامِ ارمانِ راحت کے　　ہزاروں جھومتے پھرتے ہیں متوالے محبت کے

(۲)

دکھاتا ہوں میں اب کشمیر کا اک مختصر نقشہ　　وہ کیف انگیز عالم بھی کہ جو تخئیل پر گذرا
تصور کی مدد سے اک نیا عالم دکھاتا ہوں　　نگہ کے سامنے میں جنتِ ارضی کو لاتا ہوں
یکایک حُسن کی دُنیا کی جب محفل نظر آئی　　تو میرے عالمِ نظارہ پر وارفتگی چھائی
نگہ میں پہلے میرے خوشنما اک برق سی چمکی　　دکھائی دی مجھے پھر اک نشاطِ رُوح کی دیوی

بھرے دامن میں اپنے پھول تازہ باغِ راحت کے
لئے ہاتھوں پہ پنے جامِ رنگیں بزم اُلفت کے

لبوں پر مسکراہٹ اور نگاہوں میں تھی وہ شوخی
کہ رگ رگ میں تڑپ اُٹھتی تھی ذوقِ عشق کی بجلی

بڑھی آگے کو مستانہ ادا ے دلرُبائی سے
ہر اک کی رُوح رنگیں ہوگئی دستِ حنائی سے

ضیاء وہ حُسن کی جس سے نگاہیں گرم ہوتی ہیں
تڑپ اُٹھتی ہے روحِ عشق آنکھیں گُم کی ہوتی ہیں

اُبل اُٹھتا ہے چشمہ ہر دل سے ذوقِ الفت کا
نظر آتا ہے ہر ذرّے پہ نقشہ بزمِ راحت کا

وہ راحت خیز عالم جسکے ہر ذرّے میں نرمی ہے
وہ سوزِ دل کا خطہ جسکے ہر پہلو میں گرمی ہے

وہ محفل عشق کی جس سے کہ دلمیں بڑھتی ہے گرمی
وہ بزمِ حُسن جسکی مثل عالم میں نہیں کوئی

وہ بزمِ رُوح پرور جس میں لطفِ زندگانی ہے
عیاں ہر ذرّے سے جسکے حیاتِ شادمانی ہے

جہاں ہر سو نظر آتی ہے شاداں حُسن کی دیوی
جہاں کے گوشے گوشے میں ہے رقصاں حسن کی لیلی

جہاں قدرت نے کی ہیں ایکجا مست حور اور پریاں
بھرا جنکا ہزاروں رنگ کے پھولوں سے ہے داماں

جہاں پر مغربی پریوں کے راحت کے ترانے ہیں
جہاں پر مشرقی حوروں کی اُلفت کے فسانے ہیں

جہاں پر داستانِ عشق سے مملو صحیفے ہیں
کہ جس کے ہر ورق میں سیکڑوں رنگین قصے ہیں

جہاں رنگیں نظر آتا ہے منظر عشق و الفت کا
چمکتا ہے جہاں ہر ایک ذرہ بزمِ راحت کا

(باقی آئندہ) خاص

(بقیہ صفحہ ۱۰۲ کلکتہ کا عظیم الشان کرسمس ڈے)

کو بان پر بان لگانے شروع کئے تھے، مہتاب کی روشنی کا وہ انداز دلفریب کہ روشنی مہتاب کو جسکے مقابل کرمک شب تاب سے زیادہ فروغ، چرخی کا رنگِ دل آویز کہ چرخ کج رفتار کی گردش بے مدار کو بیدرنگ کو چکرا دیا ہوائی نے کچھ ایسی ہوا باندھی کہ تماشائیوں نے ہوائے سیر گلزار کو باد ہوائی اور ذلیل سے ذلیل تصور کیا انار سراپا بہار سرو آتشبار سے زنہار کم نہ تھے اُس پر درختہائے آتشبازی کا طرہ ایک طرفہ تر کرشمہ سحر آمیز تھا جسکی تعریف اور توصیف میں جو فقرۂ لطیف و گرما گرم کسی آتش بیان کی زبان سے تیزی کے ساتھ نکل گیا صاعقہ بار و شرر انگیز تھا۔

چرخ کھا کھاکے تا بہ چرخ بریں
شور پہنچا ہے ایک چرخی کا

دیکھکر نور جلوۂ مہتاب
رنگ مہتاب ہوگیا پھیکا

سمندر کے کنارے روشنی کا عالم کیا بیان جائے، گویا یہ سرزمین دلنشین فردوس آئین سراسر ایک غلغلہ نور قلۂ طور نظر آنے لگی اگر اس کو فروغ تجلی کا نشیمن کہئے بجا ہے اور جو انوارِ حقیقی کا مسکن کہئے زیبا ہے۔

جلوہ گستر تھا ظہور نور کا نور ظہور
جابجا روشن ہوئی تھیں بقعۂ نور کی مشعلیں

(بقیہ صفحہ ۲۰۲ پر)

نانا فرنویس

[جناب مؤرخ - ایم - اے]

مرہٹہ سلطنت کی تواریخ تمام قدیم ہندوستان کی تواریخ کی طرح ایک مسلسل بے ایمانی و دغابازی کے حالات سے پُر ہے، اُن سپہ سالاروں و جوانمردوں نے کہ جنکی کمر سے کبھی تیغ جُدا نہ ہوئی، جنکا بستر فرش زمین اور چھت کشادہ آسمان تھی، جنکی آرامگاہ پشت زین اسپ تھی، جنھوں نے اپنی طاقت و قوت بازو سے کھوئی ہوئی ہندوؤں کی طاقت کی از سرِ نو بنیاد ڈالی وے تو راہ عالم کی روش میں دفن زیر گور ہوگئے لیکن انکی نسلیں باہر کے ملکوں کے جال فریب و ہوس زر میں اسیر ہوکر اُس عزو شرف کو ناموس کے خاک میں ملادیا، آتش حسد و شعلۂ بغض نے ان کو اسقدر متوالا کردیا کہ اپنے ملک سے دغابازی کرنے میں نہ جھجکے، جس مرتبہ سلطنت کی بیخ اسقدر مستحکم و مضبوط ہوچلی تھی، جن سپوت مادر وطن کے ہندوؤں نے اسکے قائم کرنے کے لئے اپنے جسمانی عیش کو خیرباد کہدیا، اپنے خون کو بہبودیِ مُلک کے لئے پانی کی طرح بہادیا اور اپنی جانِ عزیز کو قربانی کی آگ کے حوالے کردیا، انھیں کی اولاد ایک دُوسرے کے جان کے بھوکے اور ایک دوسرے پر آمادۂ قتل ہوگئے، ملک اور سلطنت کا خیال چھوڑکر حب وطن کو الوداع کا کلمہ پڑھکر ایک دوسرے کے گلے پر چھری پھیرنے کو مستعد ہوگئے، واہ رے زمانہ کی گردش جس حکومت نے تمام ہندوستان میں ایک بار اپنا بول بالا کردیا وہی صفحۂ ہستی سے ہمیشہ کے لئے نیست و نابُود ہوگئے، جن سے اُمیدیں وابستہ تھیں کہ ملکی وحکومت کا عروج ہوگا ستارۂ اقبال مادر ہندوستان افق کی بلندی پر روشن ہوگا انھیں کے ہاتھوں چشم زدن میں اُٹھتی ہوئی مرہٹہ حکومت کی سلطنت بالو کی دیوار کی طرح زمین پر سچ مچا کر گر پڑی، اُس زمانہ کی حالت کو دیکھتے ہوئے مؤرخین کو یہی کہنا پڑتا ہے کہ حکمراں ریاست مرہٹہ میں نہ تو دور اندیشی رہ گئی اور نہ حب وطن کا ثبوت باقی رہ گیا تھا، سردار و اراکین مرہٹہ ریاست کی عقل میں اتنا بھی نہ آیا کہ کتنے ایسٹ انڈیا کمپنی

جال فریب میں گرفتار ہو کر سلطنت کی ہوس میں غریب الوطن ہو چکے ہیں تو کیا کمپنی اُنکے ساتھ ایسا سلوک موقع پانے پر کرنے سے باز رہیگی، میر جعفر کی مثال کیا اس سبق کے لئے کم تھی لیکن ہونہار کو کون مٹا سکتا ہے ایں ہمہ حالات و یہ صورتیں کب مرہٹہ کی آنکھ کھول سکتی تھیں کتنے ہی پہلے ان کے شکار ہو چکے تھے اور کتنے ہونگے وہ اُن کو معلوم نہ تھا۔

مرہٹوں کی ملکی حالت

مہاراج شیواجی کے ۵۰ برس میں سے اندر اندر دوران اٹھارویں صدی میں مرہٹہ سلطنت عروج پر پہنچ چکی تھی، اس کا ستارۂ اقبال تمام ہندوستان پر درخشاں تھا، بہادر راگھوبا نے دلی اور لاہور کے قرب وجوار کو بھی مفتوح کر لیا تھا اور افغانوں کو بھارت کے احاطہ سے باہر نکال چکا تھا، بادشاہ دلی بھی مرہٹوں کے زیر ماتحت ہو گیا تھا، شیواجی کا خاندان اپنے ستارہ کی گدی پر جلوہ افروز تھا لیکن ان کی شخصی کمزوری کی وجہ سے تمام انتظام پیشوا کے دستِ مبارک میں آ گیا تھا، مرہٹوں کے علاوہ پیشوا کے چار ارکین سلطنت اور بھی تھے۔ گائیکوار، سندھیا، بھونسلا۔ ملکر، یہ سب ملکر اس قدر طاقتور ہو گئے تھے کہ اُمید کی جاتی تھی کہ اب ہندوستان میں کسی باہر کے ملک کی سلطنت کی بنیاد نہیں پڑ سکتی

لیکن ہنوز ہندوستان کی تقدیر میں اپنے نمک حرام اولادوں کا عذاب بھگتنا لکھا تھا مرہٹہ سرداروں و سپہ سالاروں کی بھی طاقت انتہا تک پہنچ چکی تھی، اس میں حسد کی آگ بھڑکنے لگی تھی، صرف موقع کی دیر تھی کہ شعلہ جل اٹھیں اور یہ موقع افغانستان کے حملہ سے مل گیا، جس وقت کہ احمد شاہ ابدالی کی فوجیں مرہٹوں کے ساتھ جنگ میں ہنر شمشیر و کارنامے جوانمردی و دلیری کا ثبوت دے رہی تھی اور وہ نازک وقت جنگ میں آ پہنچا تھا کہ فیصلہ قسمت کا ہو جائے ملہر راؤ ہلکر نے پیشوا کے ساتھ دغا کی اور پوشیدہ طور سے اپنی فوجیں لیکر جنگ سے کنارہ کش ہو گیا، جس وقت کہ تمام سپہ سالار مرہٹہ سلطنت ایک دوسرے سے ملکر باہمی نفاق کو طاقِ نسیان پر رکھکر ایک دشمن عام کے سامنے اپنی جان کی قربانی کرتے ٹھیک اُس گھڑی ملہر راؤ ہلکر دشمنوں کے اشاروں پر ناچنے والا اپنی فوج کو جنگ سے فرار ہو جانے کا حکم دے دیا، اس کا علٰحدہ ہونا تھا کہ مرہٹوں کے پیر اُکھڑ گئے۔ اور ہندوستانی نیز مرہٹوں کی سلطنت کا فیصلہ ہو گیا، اُس روز سے پھر شمالی ہندوستان میں مرہٹوں کی اس شکست عظیم کے بعد قدم رکھنے کی جرأت نہ پڑی۔ ملہر راؤ ہلکر کی دغابازی کے بعد گویا تمام سرداروں میں اس بات کی ایک مثال قائم ہو گئی یعنی سپہ سالار نے اپنے قوتِ بازو و جانفشانی کے زور سے کٹک سے لیکر کرناٹک تک اور بنگال سے گجرات تک مرہٹہ سلطنت

پیشوا نارائن راؤ

کے جھنڈے گاڑ دئے تھے اور پیشوا کو ایک طرح سے تمام ہندوستان کا شاہنشاہ بنا دیا تھا وہی بعد میں اس قدر ذلیل و رسوا ہوگئے کہ اپنے ہاتھ کے جمائے ہوئے پودے کو بھی اُکھاڑنے میں ہچکے، یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ نقص واقعی کہاں پر تھا، مشہور مرہٹہ سپہ سالار رگھوبا انگریزوں کے ورغلانے میں تو پیشوا کا سب سے خطرناک جانی دشمن ہوگیا تھا، اُس نے اپنے بھتیجے مادھو راو پیشوا کو دھوکا دیکر خود انگریزوں سے پیشوا ہو جانے کی صلح اور شرط کرلی، چار اراکین۔ گائیکواڑ، بھونسلا، اور سندھیا ہر ایک نے پیشوا کو دھوکا دیا اور بھکانے ورغلانے میں آکر ایک دوسرے پر حملہ کرنے کو تیار ہوگئے، گائکواڑ نے صاف صاف اور کھلم کھلا پیشوا پر حملہ کیا اور گجرات میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے پیر ہمیشہ کے لئے جم جانے دئے، مادھوجی سندھیا نے جو پیشوا کی طرف سے انگریزوں کو گجرات سے بدر کرنے کے لئے روانہ کیا گیا تھا جان بوجھکر انگریزوں پر حملہ آور نہیں ہوا، رشوت و انعام کی لالچ میں آکر اپنے ملک کے مال و دولت کو باہری ملکوں کے ہاتھوں لوٹ جانا بہتر خیال کیا مودا جی بھونسلا نے پیشوا کے ساتھ عین وقت پر ایسی دغابازی و مکاری کی جس وقت کہ پیشوا کو اسکی سچی خدمت کی ضرورت تھی جس وقت کہ چاروں طرف سے مصیبت و آفت کے بادل مرہٹہ سلطنت پر اُمڑ رہے تھے اس وقت پیشوا کے وزیر نے اجی جی بھونسلا کو بنگال سے انگریزوں کو نکالکر باہر کرنے کے لئے مقرر کیا لیکن بھونسلا ناعاقبت دور اندیشی کے باعث کمپنی کے ملازمین کے رشوت کے جال میں گرفتار ہوکر بنگال پر چڑھائی کرنے سے باز رہا مہارانی اہلیا بائی کے وزیر و صلاح کار تکاجی ہلکر نے باہر کی قوموں کی دی ہوئی لالچ کے جال میں پھنسکر بغیر کسی وجہ کے اپنے نہایت عزیز و نزدیکی دوست کے اوپر حملہ کر ہی بیٹھا، اس سانحہ وحشت حادثہ کے بعد جبکہ لائق و قابل دولت راو سندھیا پیشوا کی رہی سہی طاقت کا پھر سے بندوبست و انتظام کر رہا تھا، اُسی وقت انگریزوں کے ورغلانے میں آکر یشونت راؤ ہلکر نے دولت راؤ سندھیا کے سلطنت پر چڑھائی کردی، وہاں کی فتحیابی سے اسکی جرأت اور بڑھی اور آگے چلکر اُس نے پونا پہنچکر آخر پیشوا کو پونا چھوڑ کر بھاگ جانے پر مجبور ہی کیا، اس طرح مرہٹہ ملک کے دغابازوں نے اپنے پیر میں خود کلہاڑی مارلی اور اپنے ذاتی فائدہ کے عوض میں غنیموں کے حوالے کردئے جسکا انجام یہ ہوا کہ اب تک ہندوستان غلامی سے رہا نہ کیا جاسکا، قدیم ہندوستان کی اسی نازک حالت اور اسی قسم کی مکاری کو دیکھکر دل میں از حد رنج پیدا ہوتا ہے؛ جس وقت بھونسلا کے بربادی کا سامان کیا جا رہا تھا اس وقت سندھیا اور ہلکر خواب غفلت میں بے فکر اور مست تھے، اور جس وقت نحوست کی گھڑی سندھیا کے سر پہ

سوار ہوئی، بھونسلا اور ہلکر عیش وآرام سے
اپنی اپنی ذاتی دھن میں غرق تھے اور جس گھڑی
ہلکر کو آفت کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا شاید اس وقت
سندھیا اور بھونسلا کے دربار میں ناچ اور گانے
کا انتظام ہوتا رہا ہو، غرضیکہ قصہ کوتاہ جب گھڑی
نحوست کی آپہنچتی ہے اور جب چیونٹی کو فنا ہونا ہوتا
ہے تو اُس کے پر نکل آتے ہیں، اسی طرح ناعاقبت اندیش
مرہٹہ راجا اپنے اپنے کو مطمئن و محفوظ سمجھکر ایک
دوسرے کے تباہی پر پے در پے تھے لیکن انجام اُسکا
باری باری ہر ایک کی تباہی ہوئی، لیکن ہندوستان
کی تواریخ کے مضمون میں ایسی مثالیں کم نہیں ہیں
افسوس تو اس بات کا ہے کہ اگر سپہ سالاروں اور
سرداروں میں اس قسم کی دغابازی بھری ہوئی تھی
تو نیچے کے نوکروں اور خدمتگاروں میں کیا حالت
رہی ہوگی۔

لیکن زمانہ بھلے اور بُرے دونوں کی پرورش
کرتا ہے، جب ذاتی نفع کے لالچ میں اسیر بلا
ہوکر سندھیا یا ہلکر ملکی خدمت کا خیال برطرف
کر مادر وطن کے اوپر دغابازی و فریب کا ناٹک
کھیل رہے تھے، ایسے وقت میں بھی مرہٹہ
سلطنت وفادار خدمتگار و حق پرست شخصوں
سے خالی نہ تھی، وقت گذرنے پر دانشمند انکی
قدر کرینگے اور ایسے باوقار و شرف گھر والوں کو
آنے والی نسلیں اپنے دلوں میں جگہ دینگی۔
رگھوبا و نیز مادھوجی سندھیا بیوفا، مکار اپنے
ملک کا ناحق خون کرنے والوں کے درمیان
سکھا رام باپو و نانا فرناویس ایسے سچی خدمت
کرنے والے، ملک کے لئے جان دینے والے بھی
لوگ تھے، ملکی آزادی و خود مختاری کے قائم
رکھنے کے لئے باجی راؤ پیشوا نے بہت کچھ ہاتھ
پاؤں مارے اور اس کے تین وزرا مسمّٰی خورشید جی،
جمشید جی مودی و سمیک جی کے ملک کے لئے
قُربان و نثار ہو جانا کسی بھی ملک کی
تواریخ کے صفحوں میں سونے کے حرفوں میں
لکھا جاسکتا اور کوئی ملک ایسا نہیں ہے جسکی
سرزمین میں اگر ایسے لال پیدا ہوں تو وہ
نیک بخت و طالع سپہر نہ تصور کیا جاویگا۔

لیکن دور اندیشی و ملک راستبازِ خدمتگاروں
میں نانا فرناویس کے سر پر تاج سبقت ہے،
نانا فرناویس اپنے وقت کا سب سے سیاسی
معاملات کا جانکار تھا، ایک طرف ہسٹنگز وولزلی
ایسے گورنر جنرل کہ جنکے پھندوں میں آیا ہوا
پھر رہائی سے ہمیشہ کے لئے مایوس ہو جاتا تھا،
دوسری جانب آپس میں مرہٹوں کے قول وفعل
عہد و پیمان کا اعتبار نہ رہ گیا تھا، فریب اور
مکاری ان کے مذہب تھے وفادار حق پرست
نانا فرناویس ان دو طرفہ معموں کے اندر پھنسا ہوا
تھا لیکن مثل مشہور ہے سانچ کو آنچ کہاں! اس
لیاقت و دانشمندی کا جوہر دکھلایا کہ حریف اُسکا
پہلو مان گئے، جب تک فرناویس کے دم میں دم

رہا اور اس فضائے عالم کی سانس لیتا رہا تب تک
پیشوا کے برخلاف کسی کی بھی کوئی تدبیر کارگر
نہ ہونے دی، اُسکی دُور اندیشی کی کسوٹی پر
کوئی فریبی کا کھوٹا سونا نہیں چل سکتا تھا، جو
جواںمرد ہیں، ملکی خدمت کا جوش جنکی جسمانی
رگوں میں موجزن ہے، اُن کے اوپر اگر مصیبت
کا بادل ہی کیوں نہ ٹوٹ پڑے لیکن وہ اپنے
حق پر ثابت قدم و اپنے فرائض سے منہ نہ موڑینگے
سنا جاتا ہے کہ زمانہ مکاروں کی پرورش کرتا ہے
حق پرستوں کو خاک میں ملاتا ہے، اگر اس پر غور
کیا جائے تو مثل بہت ہی موزوں و مناسب ہے
وجہ اس کی یہ ہے کہ دُنیا زیادہ تر مکاروں کی
ہے، چور چور چچازاد بھائی کا افسانہ ہے، ایسی
حالت میں نانا فرناویس کو جن مصیبتوں کا سامنا
کرنا پڑا ہے وہ معمولی انسان کی طاقت برداشت
کے احاطہ سے باہر ہیں، پیشوا کی بہبودی کے لئے
وہ جیل میں ڈالدیا گیا، ہزاروں سے دُشمنی مول
لی، دشنام کھلایا لیکن وہ روح پاک جو اس کے
جسمانی قفس میں بند تھی صرف ایک حرف دوہرانا
سیکھے تھی "ملک و قوم کے لئے" مبارک ہے وہ
ملک، مبارک ہے وہ قوم، مبارک ہے وہ
خاندان جہاں ایسے راستباز و نمک حلال ملکی
خدمت گار پیدا ہوتے ہیں۔

باہری تجاروں کے بابت نانا فرناویس کی
ہمیشہ یہ رائے رہی کہ وہ ملک میں قدم نہ جمانے
پاویں، ایک بار نانا نے مادھوجی سندھیا کو انگریز
سے دوستی کرنے کے نقصانات یوں لکھا تھا "انگریز
کو اس سلطنت کے اندر پیر نہ رکھنے دینا چاہئے
اگر ان کے قدم ایک بار بھی جم گئے تو سارا ملک
خطرہ میں پڑ جائیگا، نانا فرناویس کی یہ دور اندیشی
کتنی دانشمندی کی گواہ ہے، نانا فرناویس نے
خود اس رائے کو تا زندگی اس سختی و بے مروتی
سے کام میں لیا کہ پیشوا ور دربار میں رہنے والے
چارلس میلٹ مسمّٰی انگریزی سفیر کو ہار مان کر
پونا میں ایک خط میں لکھنا ہی پڑا، جب تک
کہ پونا میں نانا فرناویس زندہ ہے تب تک مرہٹہ
سلطنت میں پیر جمالینا خواب و خیال ہے"، نانا فرناویس
ایسا دُور اندیش، حق پرست، ملک کا سچا خادم
تھا کہ انگریزوں کے صیقل میں کبھی نہیں پھنسا
جس نے آزادی کے ٹمٹماتے ہوئے چراغ کو
جلتا رکھا، جس نے ملک کی بہبودی میں اپنی
غرض کو شامل نہیں ہونے دیا، ایسا انسان
نانا فرناویس تھا اور وہ ضرور قابل عزت ہے۔

نانا فرناویس کے پدر و آبا پیشوا کے دربار میں
بخشی یا خزانچی کا کام کرتے تھے، لڑکپن میں وہ
بالاجی جناردن کے نام سے مخاطب کیا جاتا تھا
بالاجی جناردن سن طفلی ہی سے پیشواؤں کے
زیر سایہ رہے اور پیشوا بھی اُن کو بہت چاہتے
تھے اور یہی وجہ تھی کہ لڑکپن کی عمر میں سیاسی
و ملکی معاملات سے ان کو خوب واقفیت ہوگئی

تھی اور انتظام کے ہر پہلو سے روشناس ہو گئے
تھے، ناتا فرنا ویس نے اپنی چشم سے خود پانی پت
کے میدان میں مرہٹوں کی بڑھتی ہوئی طاقت
کا زوال دیکھا تھا، جن اسباب و وجوہات سے
یہ نوبت ہوئی تھی اس کا اثر ان کے دل پر
بہت گہرا پڑا، بالاجی جنارون ہی نے اس
سانحہ وحشت غم کا افسانہ سب سے پہلے پونا پہنچکر
پیشوا کے گوش گذار کیا، اس کے پہلے ایک قاصد
یہ خبر لاچکا تھا کہ "دو موتی غائب ہوگئے، ستائیس
مور بن تباہ ہوگئیں، چاندی اور تانبے کا کس قدر
نقصان ہے وہ شمار نہیں کیا جاسکتا۔

کمپنی کی تین تمنائیں

اس دردناک قصہ کا بالاجی باجی راؤ پر
اتنا اثر ہوا کہ ان کی صحت خراب ہونے لگی اور
وہ کچھ ہی ہفتوں کے بعد راہی عدم ہوئے، باپ
کی موت کے بعد ان کا صغیر سن لڑکا مادھو راؤ
اپنے چچا رگھوبا کی سرپرستی میں وارث تخت ہوا
رگھوبا کا پورا نام رگھوناتھ راؤ تھا، پنجاب کی
فتح کا نام رگھوبا ہی کے سر مڑھنا چاہئے لیکن
جسقدر دلیر و بہادر تھا اتنا ہی ناعاقبت اندیش
سونے میں سہاگا۔ ناعاقبت اندیشی کے ساتھ
بے وفاداری۔ اسی وجہ سے جب پیشوا دربار میں
رگھوما کا یوں بول بالا ہوا کمپنی کی جنوبی ہندوستان
میں بن آئی، مشہور و معروف تواریخ نویس کمپنی
کے ارادے کا حال یوں لکھتا ہے "کمپنی کے ڈائرکٹران
اس بات پر تلے ہوئے تھے کہ مرہٹہ کی سلطنت
کو کوئی دھکا پہنچے اگر ملک کی دیگر قوتیں باہم ملکر
مرہٹوں پر آمادۂ جنگ و جدل ہوتیں تو وے اپنے
دلوں میں پھولے نہ سماتے۔ اس آرزو کے کامیاب
ہونے کے لئے کمپنی کے ملازمین نے رگھوما کو بہکانا
شروع کیا، رگھوما پر یہ بھی ظاہر کیا کہ دکھن کا
صوبہ دار نظام الملک بہت ہی جلد سلطنت مرہٹہ
پر فوج کشی کرنے والا ہے، دھمکی سے خائف
ہوکر رگھوما نے فوراً گورنر بمبئی کو لکھا کہ اگر کمپنی
اپنی فوجوں سے مرہٹوں کی مدد کریگی تو دربار پونا
سے سلسٹ اور بسین کے جزائر کمپنی کو خدمت کے
صلہ میں مرحمت کردئے جائینگے، کمپنی کو تو منہ مانگی
مراد ملی، گو کہ اس دھمکی کی ہستی بالکل بے بنیاد تھی
یعنی نہ تو نظام نے حملہ کیا اور نہ انگریزوں نے مدد ہی
کی لیکن اس سے رگھوبا کی کمزوری کے پہلو کو انگریزوں
نے بھانپ لیا، حریف جب اپنے مقابل کے کسی
خاص کمزور عضو سے واقف ہوگیا تو اُس کو اپنے جیتنے
کی اُمید دوگنی ہوجاتی ہے۔

اس صلحنامہ کے بعد پیشوا کے دربار میں ایک
انگریزی سفیر مسمی ماسٹن حاضر ہوا، اب اور نئے
نئے گل کھلنے کو تھے، کمپنی کے دل میں ایک نیا
خار کھٹک رہا تھا، ایک طرف نظام، دوسری طرف
حیدرعلی تیسری جانب مرہٹہ اور چوتھی یعنی نظام
میں تباہی ہی دکھائی دیتی تھی، انگریزوں کو

مارواڑ کی مشہور سواری (اونٹ)

مارواڑی کنجر

پیشوا نارائن راؤ کے قتل کا نظارہ

[پیشوا نارائن راؤ اور کوئی چارہ نہ دیکھکر اپنے چچا رگھوبا کے پاس بچنے کے واسطے گئے - مگر وہ پہلے هي سے اُدھر ملا هوا تھا - پیشوا کے ایک همدرد دوست نے اپنے مالک کے بدن سے چمٹ کر پہلے خونیوں سے اپنا بدن ٹکڑے ٹکڑے کرا دیا ، تب کہیں نارائن راؤ اپنے چچا کی گود میں دم توڑ سکے -]

یشونت راؤ هولکر

یقین تھا کہ اگر خدانخواستہ یہ تین طاقتیں آپس میں ایک ہوگئیں تو انگریزوں کا ہندوستان کی ہوا میں بھی گذر ہونا دشوار ہوگا، ایسی حالت میں اپنی بہبودی کے لئے تو یہ لازمی تھا کہ ان تینوں کے درمیان صلح ہونے کے عوض ایک قوت دوسرے طاقت کے درپے رہے، کمپنی کو اس سے دو فوائد تھے، اوّل اگر مرہٹے آپس میں جھگڑے و فساد میں محو رہینگے تو انگریزوں کو بنگال میں اپنی سلطنت کے بڑھانے کا راستہ صاف مل جائیگا، ایلپا خار پر چلنے سے بچت ہوجائیگی، کمپنی کی دوسری خواہش یہ بھی تھی کہ سالسٹ کا جزیرہ، بسین کا قلعہ پیشوا دربار سے کسی طرح حصول ہوجائے، ان دو مقامات سے کمپنی کی بہت سی تمنائیں لبستہ تھیں، اوّل تو یہ کہ فوج و گودام کے لئے محفوظ جگہ دستیاب ہوجائیگی دوسرے مغربی ساحل پر کمپنی کے پھیلنے کے لئے خاصا انتظام ہوجائیگا مسٹر ماسٹن ڈائرکٹر کی جانب سے اسی غرض سے پونا تشریف لائے تھے ڈائرکٹران نے گورنر بمبئی و وہاں کے کونسل کو مورخہ ۳۱ مارچ ۱۷۶۹ء کو حسب ذیل مضمون کا ایک خط لکھا تھا۔

"سالسٹ و بسین و نیز ان کے قرب و جوار کی زمین و مرہٹوں کی صورت میں مقبوضات، یہ ایسی بیش بہا چیزیں ہیں کہ ان کو گورنر کو چاہئے کہ ہر صلح، ہر خط و کتابت ہر جنگ جدل میں ان پر اپنی نگاہ رکھے اور انکے حصول کے لئے موقع کو ہاتھ سے جانے نہ دیا جائے۔

۱۷۷۳ء میں ماسٹن نے سرزمین ہند پر اپنے قدم رکھے، کونسل بمبئی نے اُسے فوراً ہی اپنے سفیر بناکر پونا کو روانہ کیا، مشہور مورخ گرنٹ ڈف ماسٹن کے تشریف آوری کی مصلحت کا حال قلمبند کرتے ہوئے بیان کرتا ہے۔ "بمبئی سرکار کو ماسٹن کے مقرر کرنے کا دلی مقصد یہ تھا کہ ماسٹن مرہٹہ کے گھروں میں کسی طرح سے نفاق و نااتفاقی کے تخم بو دے تاکہ یہ حیدر علی و نظام سے مل نہ سکیں۔"
اس وقت تک گنگا کے شمال میں مرہٹوں نے اپنے دور دورہ کا آغاز کردیا تھا، مل کی تواریخ سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۷۷۳ء میں اگر مرہٹوں میں خاندانی نااتفاقی نہ ہو جاتی تو وہ بالضرور رہیلکھنڈ الہ آباد اودھ پر فوج کشی کرتے، انجام مشتبہ نہیں تھا، فتح مرہٹوں ہی کے ہاتھ میں رہتی، انگریز مورخ سے ہی کمپنی کی نیت کے حال کا پتہ چل جاتا ہے

رگھوبا کی بغاوت

ماسٹن پونا میں وارد ہوتے ہی اس چال کی صورت کامیابی تلاشنے لگا، رگھوبا تو پہلے ہی سے کمپنی کا خریدا ہوا غلام ہوچکا تھا، اس نے ماسٹن کی مدد میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی لیکن جس دربار میں فرنا ولیس ایسے دوراندیش و دانشمند لوگ موجود تھے وہاں دغابازہ وہوشیار نہ سفیر کی دال گلنا آسان نہ تھا، نانا ان دونوں

یعنی رگھوبا و ماسٹن کی چالوں سے خوب واقف تھا، نانا نے اس صلح کی جو کہ رگھوبا نے انگریزوں سے کی تھی مخالفت کی پیشوا مادھوراؤ کامل طور سے نانا کی رائے کے ساتھ موافقت کرتا تھا، ماسٹن کو اب پتہ چلا کہ جب تک نانا مرہٹہ سلطنت کا کارکن ہے تب تک سالسٹ اور بسین کا ملنا چندے کارے دارد۔

اب ماسٹن نے ایک دوسری صورت اختیار کی، رگھوبا و نانا میں اگر نا اتفاقی ہو جائے تو اُنکا کام بنجائے، اسکی فکر میں وہ اب مشغول ہو گیا۔ رگھوبا ماسٹن کے سمجھانے پر مادھوراؤ کو نانا فرناویس کیطرف سے بدظن کرنے لگا، مادھوراو لیکن اب تک بالغ ہوگیا تھا اور اس کے دل میں نانا کی طرف سے بہت عزت تھی، رگھوبا کی چال کا پانسہ اسی کے خلاف پڑا، مادھوراؤ نے بدظن ہو کر رگھوبا کو قید کر لیا لیکن رگھوبا کو جلد ہی اس اسیری سے نجات مل گئی، اسی درمیاں میں جبکہ مرہٹہ سلطنت کا دربار جھگڑے و فساد کا شکار ہو رہا تھا مورخہ ۱۸ ار نومبر ۱۷۷۲ء کو پیشوا مذکور کا ۲۸ ہی سال کی عمر میں انتقال ہوگیا، اس مرگِ ناگہانی سے لوگوں کو ماسٹن پر شبہ ہوتا ہے۔ اور اس شبہہ کے کئی دلائل اب بھی موجود

(بقیہ مضمون صفحہ ۱۹۴ کا)

تھے ستاروں کی طرح روشن جو سڑکوں پر چراغ
تھا فروغ نور سے ہر جادہ مثل کہکشاں

شب یلدا کو ہجوم چراغاں نے روز روشن بنا دیا تھا، یا آفتاب جہانتاب خود چشم تماشا بنکر اس روشنی کی کیفیت دلکش دیکھنے کے لئے زمین پر اُتر آیا تھا، شہر میں اکثر دوکانداروں نے اپنی اپنی دوکانوں میں جھاڑ و فانوس اور ہانڈیاں موقعہ بموقعہ آویزاں کی تھیں اور گلاس ہائے رنگیں قطار در قطار جدول نما حاشیہ وار اس حسن ترکیب سے لٹکائے تھے کہ جس کا فروغ نور بارنگاہ کور مادر زاد کے لئے کحل الجواہر چشم بصیرت بن گیا تھا۔ اور نابینائے تاریک نظر کی آنکھیں بھی اس جلوۂ عالم افروز سے خیرہ و تیرہ ہو کر چکا چوندھ میں آتی تھیں، ہجوم چراغاں سے کیفیت دوبالا پیدا تھی، عکس روشنی سے سطح آب یکسر عالم نور بن گیا تھا آب رواں بصد جان و دل ان چراغوں کی آئنہ داری میں ہمہ تن مشغول تھا، مردم آبی اپنے اپنے گھروں میں بیٹھے خوشی بخوشی مفت کی دیوالی منا رہے تھے۔ غباروں کی کثرت سے کرۂ ہوا میں چرخ کوکب کا انداز دلنواز موجود تھا، غبارے نہ تھے بلکہ قاصدان آتشیں پیکر اس جشن جانفزا کی خبریں لیکر متواتر عالم بالا کے رہنے والوں کو یہ مژدۂ جانفزا اور نوید دلکشا پہنچانے کے لئے گرما گرم تیز قدم جا رہے تھے۔

غرضکہ اس جشن مسرت کی دھوم دھام اور اس جلسۂ عشرت کا اہتمام سوائے یہاں کے کہیں دیکھا نہ سُنا۔

خاص

ہیں لیکن اتنا زمانہ گذرنے پر اتنی رازدار پوشیدہ باتوں کا عقدہ کھلنا دُشوار ہے، پیشوا کی موت پر گرنٹ ڈف لکھتا ہے۔ "مادھوراؤ پیشوا کی موت گویا بربادی مرہٹہ سلطنت کی پیغام تھی، پانی پت کی شکست سے اس قدر سلطنت کو دھکا نہیں لگا تھا جتنا اس کمسنی میں دفعتًا پیشوا کی موت سے، اجل کے ایک تند جھونکے نے گویا تمام سلطنت کو ہلا دیا اور اب اس کا قائم رہنا بہت ہی مشکل کام تھا، مادھوراو فنِ جنگ میں کمال رکھتا تھا اور انتظامی معاملات میں بھی اس کو کافی مقدرت تھی لیکن رضاء الٰہی سے چارہ کیا۔

ناراین راؤ برادر مادھوراؤ تخت کا مسند نشین ہوا مرتے وقت مادھوراو نے رگھوبا سے التجا کی تھی کہ ناراین راؤ کی حمایت وحفاظت کیجئیگا لیکن رگھوبا اور ماسٹن کو اُس موقع سے اچھا وقت کب مل سکتا تھا، مادھوراؤ کے انتقال کے آٹھ ہی ماہ بعد مورخہ ۳۰ اگست ۱۷۷۳ء کو رگھوبا نے اپنے بھتیجے نارائن راو کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور اپنے آپ کو پیشوا کا لقب اختیار کرلیا، تواریخ سے صاف عیاں ہے کہ ماسٹن بھی اس ناحق خونریزی میں شامل تھا یا نہیں، اُس نے بمبئی کونسل کو خبر لکھتے ہوئے بڑی خوشی کا اظہار کیا ہے۔

اس مژدہ مبارکبادی کو سُنکر بمبئی کونسل کو بھی ازحد خوشی ہوئی، پیشوا نارائن راؤ کے قتل کے ۱۰ روز بعد ۱۰ ستمبر ۱۷۷۳ء کو بمبئی کونسل نے حسب ذیل ہدایت نامہ ماسٹن کے پاس روانہ کیا

"کوئی بھی تدبیر اُن دونوں جزائر کے لینے میں اُٹھا نہ رکھنا، جو کچھ بھی ہو مرہٹوں کی راجدھانی چھوڑکر باہر نہ جانا۔"

اس موقع پر سر ہنری لارینس کلکتہ ریو میں ایک مقام پر لکھتا ہے:-

"بعد میں رگھوبا نے نارائن داس کو مارڈالا . . . . انگریزی حکومت نے اس کا ساتھ دیا۔ . . . . ہندوستان میں کمپنی کی سلطنت کی تواریخ کا یہ ایک نہایت دُشنام و ناموس باب ہے۔"

پورندھر کا صلحنامہ

پیشوا نارائن داس کے غیر معمولی قتل کے بعد ماسٹن نے سب سے رگھوبا کو پیشوا بننے میں حمایت کی اس کے بعد اس کی توجہ تینوں بڑی طاقتوں میں نا اتفاقی پیدا کرنے کی طرف ہوئی، اس وقت مرہٹہ حیدر علی اور نظام ہی تین سلطنتیں تھیں جنکو چور چور کر دینا ہی انگریزوں کے لحاظ سے مناسب تھا، ماسٹن نے حیدر علی و نظام دونوں سے لڑائی چھیڑنے کے لئے رگھوبا کو بھڑکایا، کوتاہ عقل رگھوبا گھر سے ایک بڑی فوج آراستہ کرکے جنوبی ہندوستان کی فتح کے لئے نکل پڑا۔

رگھوبا کے پُونا سے عدم موجودگی میں مُلک کے چند خیر خواہان و نانا فرناویس نے اپنی طاقت کو راجدھانی میں مستحکم کرلیا، فضل الٰہی سے انھیں

درمیان میں بیوہ مہارانی نارائن راؤ کے بطن مادر سے ایک لڑکا پیدا ہوا، ان لوگوں نے اس کو وارث تاج وتخت مرہٹہ سلطنت اعلان کردیا اسی بڑھتی ہوئی مخالفین کی قوت کو دیکھکر رگھوبا کی ہمت پونا واپس ہونے کی نہ ہوتی تھی، طرہ یہ کہ جنوبی ہندوستان میں شکست بھی کھائی وہ سیدھا انگریزوں کے سحر کا شکار بنا ہوا سوئے گجرات روانہ ہوا، کمپنی کے اب مزے ہی مزے تھے جس صورت حال کی اتنے دنوں سے تسبیح پھیری جارہی تھی وہی دعا قبولیت کے درجہ سے گذری یہاں مورخہ ۶ رمارچ ۱۷۷۵ء کو انگریزوں سے ایک نیا صلحنامہ لکھا گیا، اُس صلحنامہ کے شرط کے بموجب سالسٹ وبسین وکچھ مواضعات قرب وجوار سورت میں انگریزوں کو ہمیشہ کے لئے دیدئے گئے اُس انعام کے صلہ میں انگریزوں نے رگھوبا کو پھر پیشوا کی گدی پر بٹھلانے کا وعدہ کیا، کمپنی کی فوجیں رگھوبا کو لئے ہوئے پونا کی طرف بڑھیں، جنگ میں نانا فرناویس کی روانہ کی ہوئی فوج نے وہ جوہر مردانگی دکھلائی کہ انگریزوں کو بہت سے نقصان کے ساتھ پسپا ہونا پڑا اور وہ پھر گجرات کی طرف بھاگ گئے۔

اس درمیان میں گجرات کی سیاسی فضا کمپنی کے مزاج کے موافق تھی، گائکواڑ کے خاندانی جھگڑوں سے بہت کچھ فیض اُٹھایا، ساجی گائکوار سے صلح کرنے پر بھڑوچ، کھپلی، بریاو اور کورل کے پرگنے کمپنی کو مل گئے، ماسٹن نے اب پونا چھوڑکر گائکواڑ میں سکونت اختیار کی، پیشوا سرکار نے رگھوبا کی صلح کو ناجائز قرار دیا اور ایسی حالت میں انگریزوں کے دونوں جنبا پر قبضہ زیادتی سمجھی گئی جس کا انجام یہ ہوا کہ انگریزوں کو پونا میں سفیر بھیجنے کا کوئی ذریعہ نہیں رہ گیا، اب موقع کمپنی کے لئے بہت نازک آگیا تھا، پونا میں گھس کر شرارت کرنے کا راستہ بند ہوگیا تھا، رگھوبا کو پھر سے پیشوا بنانا ناممکن تھا لیکن ایسے موقعوں پر کمپنی کا استقلال و چالاکی قابل تعریف ہے۔ وارن ہسٹنگز گورنر کلکتہ نے اپنی چالاکی سے ایک نئی و نرالی تدبیر نکال ہی لی، اُس نے سیدھے کلکتہ سے ایک سفیر پونا کو روانہ کیا کہ بمبئی کونسل و رگھوبا کے سابق تعلقات پر کمپنی کے گورنر جنرل کو بیحد افسوس ہے، یہ دونوں کام ہماری خواہش ومرضی کے خلاف ہوئے ہیں، ہم صورت کی صلح کو ناجائز قرار دیتے ہیں، انگریز سرکار نہ تو باغی رگھوبا سے صلح کرنی چاہتی ہے اور نہ پیشوا سرکار سے جنگ کرنا، ہسٹنگز کے حکم کو پاکر بمبئی کونسل نے اپنی بھیجی ہوئی فوج کو واپس بلا لیا۔

یہاں پر غور طلب دو باتیں ہیں، ہسٹنگز نے اپنے قاصد کو دو خطوط دئے تھے، ایک بنام وزرائے پیشوا، دوسرا بنام رگھوبا، سفیر کو ہدایت کردی گئی تھی کہ اگر پونا پہنچنے کے قبل رگھوبا کی فتح ہوگئی ہو۔

تو رگھوبا والا خط اسکو دیا جائے جس میں بمبئی کونسل کے صلحنامہ کی شرطیں پھر سے منظور کی گئی تھیں وا گر وزراء سے ملاقات ہو تو حسب بالا بیان کا خط دیا جائے ہیسٹنگز کے سفیر سے و پیشوا کے وزرا سے پورندھر میں ملاقات ہو گئی، نانا فرناویس و سکھارام ماپو بھی وہاں پر موجود تھے، دونوں طرفین میں جو وقوعات پیش آئے ان کا تذکرہ خود سفیر مورخہ ۲ر فروری ۱۷۷۶ء کو ایک خط میں وارن ہسٹنگز کو یوں لکھتا ہے :-

"وہ مجھ سے ہزار بار پوچھتے ہیں کہ آپ دوستی کی ہزار بار قسم کیوں کھاتے ہیں، آپ لوگ تو بمبئی سرکار کے جنگ کو ناجائز بتلاتے ہیں لیکن اُسکے ذریعہ سے جو مقبوضات کہ آپکو ملے ہیں اُنکو آپ اپنے پاس رکھنے کے لئے کیوں اس قدر خواہشمند ہیں، آخر یہ سب معاملہ کیا ہے"

آخر میں پونا دربار نے ہسٹنگز کی استدعا کو منظور نہ کیا، وارن ہسٹنگز نے جب یہ دیکھ لیا کہ پیشوا کو چالبازی سے پھنسانا مشکل ہے تو اپنے سفیر کو پُونا میں رہنے کے لئے ہدایت کرکے خفیہ طور سے ایک بڑے جنگ کی تیاری شروع کردی، پونا دربار کو ان سب حرکتوں سے آگاہی ہوتی رہی لیکن تواریخ سے پتہ نہیں چلتا کہ کن اسباب سے خائف ہوکر پُونا دربار کو انگریزوں سے صلح کرنی پڑی، ہسٹنگز کا قاصد پورندھر سے مایوس و خستہ حال واپس جا رہا تھا، پیشوا کے وزیر نے اس کو روک لیا تھا۔ مورخہ ۳ر جون ۱۷۷۶ء کو کمپنی سرکار اور پیشوا کے درمیان پورندھر کی صلحنامہ کی شرطیں لکھی گئیں، جس میں کہ کمپنی نے صورت کے صلحنامہ کو ناجائز قرار دیا اور رگھوبا سے قطع تعلق کرنے کا وعدہ کیا، بسئی کا قلعہ پونا دربار کو واپس کیا گیا اور آئندہ کے لئے پُونا دربار سے دوستی قائم رکھنے کا وعدہ کیا، پیشوا نے اس صلحنامہ کو پائدار بنانے کے لئے سالسٹ کا جزیرہ کمپنی کے حوالے کر دیا، اور اس کے علاوہ بھروچ شہر و اس کے قرب جوار کی زمین جسکی آمدنی قریب تین لاکھ سالانہ تھی، کمپنی کو بخشدیا اور یہ بھی قرار پایا کہ انگریزی سفیر پونا دربار میں رہا کریگا۔

یقین نہیں ہوتا کہ دُوراندیش نانا فرناویس کا ہاتھ اس معاملہ میں رہا ہوگا، یہ بعید یقین ہے کہ نانا فرناویس انگریزوں سے اس قدر نفرت کرتا تھا اور جس کو ان کی جانب سے اس درجہ کی دشمنی تھی کس طرح انگریزوں سے اس صلح کے شرط نامہ پر اپنی رائے دے سکتا تھا، پورندھر کی صلح سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پیشوا کے دربار میں نانا فرناویس کا اثر زیادہ کیا بالکل نہیں رہگیا تھا۔

پُونا کے برہمنوں نے اس صلح کرنے پر یقیناً یہ سوچا ہوگا کہ وہ اپنے نورفیق کے ہاتھ کچھ عرصہ تک امن و امان کی بنسی بجائیں گے لیکن ابھی اُنکی آنکھیں نہیں کھلی تھیں، اپنی جہالت و ناعاقبت اندیشی کا انجام سہنا و بھگتنا باقی تھا، اس صلح کا حال سُنتے ہی ڈائرکٹران کمپنی نے فوراً وارن ہسٹنگز کو یہ لکھکر روانہ کیا:-

"کچھ بھی ہو اور کیسی ہی نوبت کیوں نہ آوے ہم کسی صورت میں پہلے صلحنامہ کے بموجب ملے ہوئے اضلاع کو واپس نہیں کرنا چاہتے اور ہم لوگ یہاں سے آپ کو اطلاع دیتے ہیں کہ چاہے جس عہد و پیمان کو توڑنا ہو ان کو برسر طاق رکھکر ان مقبوضات کی حفاظت کی جائے۔"

اس سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے گویا کمپنی کے ڈائرکٹران نے وارن ہسٹنگز کو دغابازی کرنے کا پروانہ دیدیا، ہسٹنگز کے لئے اتنا اشارہ کافی تھا آتشبازی میں چنگاری پڑگئی، اس خبر کے ملتے ہی پورندھر کے صلحنامہ کی شرطوں کو توڑنا شروع کردیا، اُس نے نہ تو رگھوبا کو مدد دینا بند کی اور نہ بسیئی کا قلعہ واپس کیا، ایک جانب تو ملازمین کمپنی ان شرائط کو صاف صاف توڑ رہے تھے اور دوسری جانب پورندھر کے صلحنامہ سے ملی ہوئی رقم سے فائدہ اُٹھانا چاہتے تھے، اُنھوں نے دوبارہ ماسٹن کو پونا دربار میں روانہ کیا، ابکی بار وزراء پیشوا نے اس کی حاضری سے بہت معذرت کی اور بہت ناراضگی کا اظہار کیا، لیکن اب پیشوا دربار کی کون سُنتا تھا، کمپنی تو ان کی تباہی پر تلی ہی تھی۔

(باقی آئندہ)

فریاد

[جناب اخگر صاحب]

ترا معمول ہے سو سو ستم ایجاد کرلینا — مرا دستور آہ و نالہ و فریاد کرلینا

اگر منظور ہے جور و جفا بیداد کرلینا — کوئی تازہ ستم میرے لئے ایجاد کرلینا

ابھی صیاد تعمیر آشیاں کی نامکمل ہے — ٹھہر جا آج کے دن کل اسے برباد کرلینا

چمن والو! اسیروں کی فقط اتنی تمنا ہے — بہار آئے تو ان بھولے ہوؤں کو یاد کرلینا

گذرتی ہے نہایت شاق مجکو خانہ ویرانی — تمھیں رہزن یہ اُجڑا آشیاں آباد کرلینا

سسکتا چھوڑ دینا تو مجھے قاتل کے قدموں پر — دم آخر یہ احساں خنجر جلاد کرلینا

اگر بلبل پپیہا اور قمری یک زباں ہوتے — تو کچھ مشکل نہیں تھا باغ کو آزاد کرلینا

دعا نت صاحب قدرت کرینگے اور کیا اخگر

زیادہ سے زیادہ یہ کہ تم فریاد کرلینا

خاص

ڈوبے جی کی چٹھی

اجی سمپادک جی مہراج۔

جے رام جیکی! آخر شاردا بل پاس ہی ہوگیا۔ بڑا غضب ہوا۔ بڑا اندھیر ہوا! لوگ کہتے ہیں کہ مصیبت اکیلی نہیں آتی۔ اسکی اصلیت کسی کوتاہ بین سناتن دھرمی سے پوچھئے۔ ان بیچاروں کے لئے اچھوت ادھار، پردے کی مخالفت اور بیواؤں کی شادی کیا کم تھی۔ مزید براں شاردا بل سر پہ پھٹ پڑا! اسی سے تو کہنا پڑتا ہے کہ ایک دم جہل اور تاریکی کا زمانہ آگیا ہے کچھ ٹھکانا ہے! کہتے ہیں کہ لڑکی چودہ اور لڑکا اٹھارہ سالہ کی شادی کرو۔ اس سے کم عمر ہو تو مت کرو۔ ورنہ سزایاب ہوگے! قانون پاس کرنے والوں نے تو پاس کردیا لیکن اس قانون سے تو کتنے لوگ مصیبت میں پڑگئے۔ اس کا انھیں کیا پتہ؟ پہلی مصیبت تو یہ ہے کہ چودہ برس کی عمر میں حیض ہوجاتا ہے اور ایسی لڑکی کی شادی کرنے سے اُس کے خون پینے کا گناہ عاید ہوتا ہے۔ ارے غضب یہ تو سخت آفت ہے۔ جو لوگ گوشت خوار نہیں وہ خون نوش کیونکر ہوسکتے ہیں اور اس پر طرّہ یہ کہ وہ بھی بیٹی کا! آپ فرمائیے دھرم رہا کہ گیا؟ قانون پاس کرنیوالے تو گوشت خوار ہیں۔ اُنھیں خون ؤون پینے سے پرہیز نہیں، لیکن ہندوؤں میں تو زیادہ تر لوگوں کو خون دیکھکر غش آنے لگتا ہے۔ اس لئے یہ قانون دو کوڑی کا ہے۔

اس قانون کے جانب دار جو لوگ ہیں۔ او۔ یہ آپ چاہے جس کٹر سناتن دھرمی سے دریافت کرلیجئے کہ اس قانون کے جانب دار صرف ناستک اور

لامذہب لوگ ہیں۔ البتہ اس قانون کے جانبداروں
کا یہ کہنا ہے کہ کم عمری کی شادی کر دینے ہیں دولہ
دولھن کی تندرستی خراب ہو جاتی ہے۔ بیوگی بڑھ
جاتی ہے۔ دونوں کی جسمانی اور دماغی قوت میں نقص
پڑ جاتا ہے۔ جب اپنے رام کٹر سناتن دھرمیوں
کے نمایندہ بنکر بیٹھے ہیں، تو اپنے رام کو یہ دلیل
بے تکی معلوم ہوتی ہے۔ کم عمری میں شادی کر کے
والدین اپنے فرض سے سبکدوش ہو جاتے ہیں،
اس کے بعد لڑکی لڑکے کی تقدیر ارے یارو
والدین آل و اولاد کے پیدا کرنے کے ذمہ دار ہیں
نہ اُن کے افعال کے۔ بیٹے بیٹیوں کے زندگی بھر
کے ٹھیکہ دار تھوڑے ہی ہیں۔ اور جبکہ دھرم شاستر
کا یہ حکم ہے تو اُس کے خلاف کیسے ہو؟

دھرم شاستر بنانے والے کچھ جاہل نہیں
تھے۔ وے فی زمانہ کے لوگوں سے زیادہ تر
عاقل تھے۔ اُنھوں نے کچھ سمجھ کر ہی یہ قاعدہ مقرر
کر رکھا ہے، ہم لوگوں میں اس قدر عقل نہیں ہے
کہ اس حکمت کو سمجھ سکیں۔ لیکن حکمت اس میں
بلاشک ہے۔ یہ ماننا پڑیگا۔ جو نہیں مانتا وہ جاہل
ہے، ناستک ہے۔ اجی جناب! کیا فی زمانہ ایسی
باتیں دُنیا میں نہیں ہیں جو لوگوں کے سمجھ میں نہیں
آتیں؟ ایک فریمیسن کو ہی لے لیجئے۔ کوئی بتا
تو دے کہ یہ ہے کیا بلا۔ بتا دے تو تب جب
سمجھ میں آوے۔

اسی طرح کم عمری کی شادی کی حکمت بھی
سمجھ میں نہیں آتی۔ مذہبی معاملات میں چون وچرا
کرنا بھی تو بُرا ہے۔ بقولیکہ۔ ہر کہ شک آرد کافر گردد۔
مذہب اسلام میں اسی وجہ سے علم منطق کا پڑھنا
حرام کر دیا ہے۔ علم منطق پڑھ کر لوگ مذہبی مسئلوں
میں چون وچرا کا دخل دیویں گے اور اُس کا انجام
یہ ہوگا کہ مذہب کے جانب سے لوگوں کا اعتقاد
متزلزل ہو جائیگا۔ جب اعتقاد جاتا رہا تو مذہب
کیسا؟ اپنے رام کو تو یہ یقین ہو چلا ہے کہ جب
جب بنیاد مذہب متزلزل ہوتی ہے گیتا کے بموجب
بھگوان ضرور نمودار ہونگے۔ صغیر سنی کی شادی
کے خلاف قانون بنایا گیا۔ اس سے زیادہ مذہب
کی بیخ کنی کیا ہوگی؟ ایسی حالت میں بھی بھگوان
نمودار نہ ہوں تو یہ ان کی خطا ہے۔

دوسری مصیبت یہ ہے کہ بہت سے لوگ
اپنی لڑکی لڑکے کی شادی نہ دیکھ سکیں گے۔ اس
زمانہ میں ایک تو یوں ہی اولاد کی دیدار کے لالے
پڑے ہیں۔ دنیا بھر کے پیر پیغمبر مناکے، دُعا تعویذ
کر کے سدہ سادھوؤں کو خوش کر کے بڑھاپے میں
ایک آل یا اولاد ملی تو اُن کی شادی نہیں کر سکتے!!
والدین پا بہ گور ہیں۔ قانون کہتا ہے کہ چودہ
اور اٹھارہ سال تک شادی کا نام زبان پر نہ لاؤ۔
خاصی رہی! یہ کمبخت قانون نہ ہوتا تو پانچ سال
کی عُمر میں شادی کر کے آنکھوں کا لُطف اُٹھا لیتے۔
ننھی سی بہو گھر میں آتی چھنک چھنک گھر بھر میں
دوڑی دوڑی پھرتی!! کیا لُطف ملتا؟ ننھی ننھی

ہر شے پیاری معلوم ہوتی ہے۔ بلی کے بچے کتے
کے بچے۔ یہاں تک کہ شیر ایسے خوفناک جانور کے بچے
بھی پیارے معلوم ہوتے ہیں۔ اور ہاتھی کا بچہ
واہ واہ اُس کا تو کہنا ہی کیا ہے؟ اتنا بڑا ہونے
پر بھی کتنا پیارا معلوم ہوتا ہے، تو چھوٹی بہوئیں
نہ پیاری معلوم ہوں گی؟ اجی جناب! جب پانچ سال
کی دولہن گھونگھٹ نکال کر بیٹھتی ہے تو اُس کے آگے
ہاتھی، شیر وغیرہ سب کے بچے گرد ہو جاتے ہیں۔ اور
خاصکر جب کہ جیسی دولہن ویسا دولہ جب بھائی بہن
کی طرح کھیلتے ہیں تو (بھائی بہن کی طرح ذرا اس بات
کو تو غور سے کیجئے) اُس وقت بیساختہ زبان سے نکل جاتا
ہے کہ "اگر فردوس بر روئے زمین است۔

ہمین ست وہمین ست وہمین ست۔

اور وہ بھی دوبالا دولہ دولہن اور بھائی بہن کا۔
واہ واہ۔ آم کے آم اور گٹھلیوں کے دام! کمبخت
قانون نے یہ لطف خواب کر دیا۔ مسٹر سارد اکو
بیٹھے بٹھائے یہ کیا سوجھا۔ بیکار ہونگے بیکاری میں
ایسی ہی اُول جلول باتیں سوجھتی ہیں۔

اور سنئے، اس قانون کی بدولت پولیس کی
بن آئیگی۔ یہ میرے دماغ کی سوجھ نہیں بلکہ ایک
بُرے پُرانے بزرگوار کی کھوپڑی کی اُپج ہے۔ جی ہاں،
تو پولیس کی کیسے بن آویگی، یہ بات قدرے سُننے کے
لایق ہے فرض کر لیجئے کسی نے اپنی دختر چودہ سالہ
کی شادی کی۔ اب اگر پولیس چاہیگی تو یہ کہیگی کہ یہ
لڑکی چودہ سالہ نہیں ہے۔ اب لڑکی کے سرپرستوں
کے لئے محض دو ہی راستے رہجائینگے۔ یا تو وہ لوگ
پولیس کو کچھ دے دلا کر اُس کی زبان بندی کریں
خواہ اس بات کا ثبوت دیں کہ لڑکی کی عمر چودہ سال
کی ہے۔ چنانچہ جناب۔ لڑکی کی عمر چودہ سالہ ہے
اس کے ثابت کرنے کے لئے حافظ ڈاکٹری کروانا پڑیگا
معائنہ ڈاکٹری کرانے میں آبرو خاک میں مل جائے
گی!!! تو بھی اگر ڈاکٹر بے ایمانی کر بیٹھا اور
اس نے کہدیا کہ لڑکی چودہ سال کی نہیں
ہے تو اور بھی مصیبت ہے۔ اس سے تو لوگ بھی
اچھا سمجھیں گے کہ پولیس کو کچھ دے دلا کے معاملہ رفع
دفع کر دیا جاوے۔ اب بتلائیے پولیس کی چاندی
رہیگی یا نہیں؟ یہ جتنے قانون بنتے ہیں سب پولیس
اور گورنمنٹ کے فائدہ کے لئے بنتے ہیں۔ عوام کا
فائدہ اس سے خاک نہیں ہوتا!!!

دیکھا سمپادک جی، کتنی دور کی سوجھی ہے! میں
تو اُن کی عقل پر ترس کھا کر حیران رہ گیا۔ کیا کیا سوجھ
کے لوگ ہیں! ایسی ایسی باتیں سوچتے ہیں کہ
جن کے سر پر دو لوں موجود! لیکن آپ یہ نہیں
پہچان سکیں گے کہ سر کون ہے اور پیر کون؟ یہ کمال
نہیں تو کیا ہے۔

تیسری اس سے بڑی مصیبت جو اسوقت
بھی موجود ہے، وہ یہ کہ بہت سے تعلقات اس
قانون کی بدولت ردّی ہو جا رہے ہیں ہمارے
شہر میں ایک دولتمند ویش ہیں۔ ان کی لڑکی نو سال
کی ہے۔ اور جس لڑکے سے اُس کی سگائی ہوئی

ہے وہ آٹھ سال کا ہے!! اَب ہم بموجب قانون جب
لڑکا اٹھارہ سال کا ہوگا تو لڑکی اُنیس سال کی ہوگی!!!
اس کے مطلب یہ ہیں کہ جب لڑکی اُنیس سال کی
ہوگی تب اُس کی شادی ہو سکیگی۔ اب اس وقت
اُن ولیشہ صاحب کے جی سے کوئی پوچھے وہ بیچارے
تو قانون کے نفاذ ہونے کے پہلے ہی شادی کرنے
کو آمادہ ہیں، لیکن لڑکے والا راضی نہیں ہوتا۔ اب
لڑکی کا والد اس بات پر آمادہ ہے کہ اگر کوئی شخص
لڑکے والے کو شادی کرنے کے لئے راضی کردے تو
اُسے وہ ہزار دو ہزار روپئے دے سکتا ہے۔ اُنیس
سال تک لڑکی کیسے رُکی رہیگی۔ ہائے غضب!
سوچنے سے ہی بخار چڑھ آتا ہے؟ جن لڑکیوں کی
شادی اُنکے پیدایش کے ساتھ ہو جانا چاہیئے وہے
اُنیس سال تک بے بیاہی بیٹھی رہیں۔ ہائے۔ ہائے!
سوچئے امسال ملیریا کا زور ہے لوگوں کو اپنی اپنی
لڑکیوں کو دیکھ کر اور یہ سوچ کر کہ اسے چودہ سال
تک ناکتخدا رہنا پڑیگا، لرزہ چڑھ آتا ہے۔ یہ قانون
ڈاکٹروں کے لئے بھی فائدہ بخش ہوا۔ سب سے
پہلے تو اُنھیں کی بوہنی ہوئی۔ پولیس اور گورنمنٹ
کی باری تو بعد کو آویگی ایک دن ایک بزرگوار سے
اسی مضمون پر گفتگو ہوئی۔ وہ اس قانون کے پاس
ہونے سے بہت ہی خفا ہیں۔ مجھ سے بولے۔
"دیکھا دوبے جی، اب تو گورنمنٹ مذہبی معاملات
میں بھی دست اندازی کرنے لگی"، اپنے رام ابتک شادی
کو خانہ داری اور قومی معاملہ سمجھے تھے، اُن بزرگوا
سے معلوم ہوا کہ شادی کار مذہبی ہے۔

سناتن دھرمیوں میں تو کھانا، پینا، بول و براز
وغیرہ سب کار مذہبی سمجھے جاتے ہیں، تب شادی کیوں
نہ سمجھی جاوے؟ میں نے کہا۔ ہاں، دست اندازی
تو بلاشک کرنے لگی، مگر کیا کیا جائے؟"۔

وہ بولے۔ بھلا دیکھئے تو، یہ بھی کوئی بات ہے
ہماری لڑکی ہمارا لڑکا! ہمارا جب جی چاہے گا شادی
کرینگے۔ گورنمنٹ کے باپ کا کیا اجارہ ہے؟

میں نے کہا۔ بے شک! گورنمنٹ کے باپ کا
کیا جدامجد کا بھی کوئی اجارہ نہیں۔

"دیکھئے کاشی کے بڑے بڑے عالم و فاضل اس
کے برخلاف ہیں، وے کیا جاہل ہیں؟" "بالکل نہیں
ان کے خاندان میں سات پشت سے کوئی جاہل پیدا ہی
نہیں ہوا" مین نے جواب دیا۔ "بنگال کے ایک
مہامہوپادھیا نے اس قانون کے مخالفت میں اپنی
مہامہوپادھیائی چھوڑ دی"۔ "سچ کہنا! نہیں، مذاق
کرتے ہو"!

وہ اشتعال پاکے بولے۔ اخباروں میں چھپا ہے
دوبے جی، مذاق کیسا؟

"اچھا! تب تو اور بھی بیجا بات ہے۔ جس بات
سے لوگ مہامہوپادھیا نہ رہیں، وہ کام دو کوڑی کا۔
مہامہوپادھیاؤں کی تعداد میں کمی مذہب کے لئے
نقصان دہ ہے۔ انہیں تو پلیگ کے چوہوں کی
کی طرح مرہنا چاہیئے۔ کیوں، ہے نہ ٹھیک؟"

"ٹھیک تو ہے، لیکن پلیگ کے چوہوں والی

بات ذرا آپ نے بیجا کہی"۔

"چھ ہے نہ سہی، برساتی کیڑے سہی۔ میرا مقصد زیادتی دکھلانے کا ہے۔ الفاظ کے طرف نظر نہ ڈالئے"۔

"تو ٹھیک ہے بے شک انہیں تو پڑھنا ہی چاہئے۔ ان کے پڑھنے سے مذہب کو نفع ہے۔ لیکن یہ علامات ترقی نہیں، جو کچھ ہیں وہ بھی نہ رہینگے"۔

"تب تو کشتیِ مذہب غرق آپ سمجھئے"۔

"سمجھنا کیسا۔ غرق ہو گئی" "ہاں۔ ہاں، میں بھول گیا تھا ڈوب گئی ہے۔ ڈوب گئی۔ سب ڈوب گئی"۔ "کلجگ ہے نہ"

"بالکل مجسّم آنکھوں کے سامنے کھڑا ہے"۔

"بڑا خراب زمانہ آگیا ہے۔ اب تو پیشاب یا پاخانہ کے لئے بھی قانون بنینگے"۔

"وہ تو بہت پہلے بن چکے ہیں، شہروں میں جابجا پیشاب کر دینے سے چالان ہو جاتا ہے۔

"ہاں، مجھے یہ یاد ہی نہ تھا میرا مطلب یہ ہے کہ کھانے پینے کے لئے بھی قانون بنینگے"۔ "اُنکے لئے تو اللہ میاں نے ہی قانون بنا دیا ہے۔ الّم غلّم کھاؤ گے تو بیمار ہو جاؤ گے"۔ "مسلمانوں کے عُلما بھی تو اس کے خلاف ہیں"

"ضرور ہونگے۔ عُلما ہی ٹھہرے عُلما اور پھر کسی بات کو چُپ چاپ مان لیں، یہ اُن کی شان کے خلاف ہے"۔

"اب امسال دیکھئے کتنی شادیاں ہوتی ہیں۔ مارے شادیوں کے پار نہ ملیگا۔ سب لوگ یہی فکر کرینگے کہ قانون کے نفاذ کے پیشتر ہی لڑکے لڑکیوں کی شادی کر دیں"۔

"تب تو جشن ہی جشن ہے۔ ایسے میں آپ بھی چار چھ شادیاں کر لیجئے"۔

"کسکی شادیاں کرلوں۔ اپنی؟" "اور کیا"؟

"آپ بھی کیا مذاق کرتے ہیں"؟

"مذاق ہے تو جانے دیجئے"!

ایک بھی مت کیجئے گا۔ لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی"۔ "وہ کیا؟" اس قانون کی مخالفت وہی کر رہے ہیں، جنکی شادیاں ہو چکی ہیں یا جو قانون کے اندر نہیں آتے۔ یہ کیا بات ہے"؟

"مَیں نے آپ کا مطلب نہیں سمجھا"! "میرا مطلب یہ ہے کہ اس قانون کی مخالفت تو اُنھیں کرنا چاہئے جو اٹھارہ یا چودہ سال بلا شادی کئے نہیں رہنا چاہتے"۔

"وے تو سب بچے ہیں، وے اِن باتوں کو کیا سمجھیں۔ یہ کام تو والدین کا ہے"۔

"ہاں۔ یہ آپ نے خوب سوچی۔ مجھے یہ یاد ہی نہ رہا کہ وے بچے ہیں۔ خیر جانے دیجئے"۔

"تو اب ہونا کیا چاہئے"؟

"ہونا یہ چاہئے کہ آپ قانون کی پرواہ نہ کیجئے، جب اور جس وقت جی چاہے، شادی کر دیجئے"۔

"لیکن اس کے لئے سزا ملیگی۔ سزا صرف جرمانہ کی ہوتی تو بھی غنیمت تھی۔ سمجھ لیا جاتا کہ جہاں شادی میں چار چھ ہزار خرچ کئے، وہاں ہزار پانچ سو گورنمنٹ کو بھی نیوچھاور کے طور پر دیدئے۔ لیکن اُس جُرم

میں قید کی بھی سزا تو ہے ۔ یہ ذرا نقصان دہ بات ہے"۔

"قانون پاس کیا تھا تو محض جرمانہ کی سزا رکھی ہوتی، اس بہانہ سے گورنمنٹ کا بھی کچھ فائدہ ہو گیا ہوتا۔

قید کی سزا بے سود لگائی"۔ "بالکل بے سود ہے۔ جیل کی سزا سے نقصان کے سوا فائدہ کچھ بھی نہیں۔ جُرمانہ میں تو گورنمنٹ کو روپیہ بھی ملتے۔ جیل بھیجنے میں تو اُسے اپنی جیب سے لگانا پڑیگا۔ گورنمنٹ تو کفایت شعاری تو بالکل جانتی نہیں"۔ اور ملکی پیشوا کاروں کو دیکھئے وے بھی اُسی کی ہاں میں ہاں ملا بیٹھے۔ سوراج کے لئے تو سرکار سے لڑتے ہیں۔ اس کے لئے کیوں نہ لڑے"۔

"اس کا باعث تو مجھے معلوم ہوتا ہے کہ شادی بیاہ ایسے نیک کاموں میں لڑائی بھڑائی اچھی نہیں معلوم ہوتی۔ شادی بیاہ تو ہنسی خوشی کی بات ہے۔ اس لئے لیڈروں نے خاموشی اختیار کر لی ہو۔ شادی بیاہ کا معاملہ نہ ہوتا تو بیشک لڑ مرتے"۔

"شاید یہی بات ہو، لیکن یہ اُن کی غلطی ہے۔ اس معاملہ میں اُنھیں ضرور لڑنا چاہئے تھا"

"اجی خون خچر کر ڈالنا چاہئے تھا"۔ "انھوں نے یہ بھی نہ سوچا کہ اٹھارہ سال تک لڑکے کو اور چودہ سال تک لڑکی کو بلا شادی کئے ہوئے رکھنے سے انکے بگڑ جانے کا خوف رہیگا۔ مذہبی اصول کو چھوڑ دیجئے لیکن اس بات پر غور کرنا چاہئے تھا"؟

"بے شک! جن لڑکی لڑکوں کی شادی پانچ چھ سال کی عُمر میں ہو جاتی ہے، اُن میں سے ایک بھی نہیں بگڑتا، پھر بھی لوگ نہیں سمجھتے"۔

"اچھا، کیا مردم شماری میں یہ بات طے ہو چکی ہے"؟ "اجی بخوبی طے شدہ ہے! لیکن اب لوگ بلا پیمانہ پکر لبستہ ہیں"۔

"مجھے یہ بات نہیں معلوم تھی"

"معلوم تو مجھے بھی نہیں تھی، لیکن آپ کی باتوں سے خیال آ گیا"۔

"اگر ایسا ہے تو بڑی بیجا بات ہے"۔

"کیا کہیں۔ کچھ کہتے نہیں بنتا"۔

"خیر جی! اپنے کو کیا، اپنا تو چل چلاؤ ہے۔ آج مرے کل دوسرا دن! جنپر پڑیگی وہ بھوگینگے"۔

"یہی بات ہے ۔ اپنے کو تو اب شادی بیاہ بھی تو کرنا نہیں ہے۔ ایک بار کیا۔ اُس کا پھل اب تک پا رہے ہیں۔ اسکے بعد وہ روتے جھینکتے چلے گئے ۔ سمپادک جی، دیکھا آپ نے! شاردا بل کے مخالفت میں لوگ کیسی زبردست دلیلیں پیش کر سکتے ہیں ۔

نیازمند

بجیا نند (دوبے جی)

ہندو سوسائٹی کی ترقی و اصلاح

[لالہ رام لال صاحب ورما ایڈیٹر روزانہ "تیج"]

مشہور انگریز مدبر ایڈمنڈ برک کا قول تھا۔

"جو حکومت تبدیلی کے ذریعہ سے معرا ہو وہ اپنے تحفظ کے ذرایع سے بھی معرا ہوتی ہے۔"

ایڈمنڈ برک کا یہ رزین قول حکومت کے لئے جتنا صحیح ہے سوسائٹی کے لئے بھی اتنا ہی صادق ہے۔ کیونکہ حکومت کیا ہے؟ سوسائٹی کا سیاسی پہلو۔ تاریخ شاہد ہے کہ دنیا کی بعض بڑی بڑی قومیں جنھیں اپنی قدامت پر ناز تھا۔ صفحہ ہستی سے مٹ گئیں۔ کیوں؟ اسلئے کہ وہ تبدیلی کے ذرایع سے خالی تھیں یا یوں کہو کہ وہ تبدیلی پذیر نہیں تھیں قدامت بلاشبہ ایک شرف اعزاز کی علامت ہے۔ لیکن جو قدامت تبدیلی پذیر نہیں ہوتی وہ لازمی طور پر فنا کی علامت ہوتی ہے۔ کیونکہ زمانہ تبدیلی پذیر ہے۔ یہ اصول قدرت ہے کہ ہر لحہ جو گذرتا ہے اپنے ہمراہ تبدیلی لاتا ہے۔ تبدیلی کے بغیر ترقی ناممکن ہے۔ اگر زمانہ تبدیلی پذیر نہ ہوتا تو دس بیس سال تو درکنار صدیوں کے لامتناہی سلسلہ بھی انسانی سوسائٹی کے نظام میں کوئی ترقی نہیں کرا سکتا تھا۔ اور اس صورت میں ممکن تھا کہ مورخین کو زمانہ کے لگاتار سلسلہ میں پتھر اور لوہے کی تخصیص کرنے کی ضرورت لاحق نہ ہوتی ایولیوشن یعنی تدریج ترقی کی تھیوری کا انحصار تبدیلی پر ہی ہے۔ بس یہ تسلیم کرلینا پڑیگا کہ تبدیلی انسانی سوسائٹی سے وابستہ ہے دوسرے الفاظ میں زمانہ کی تبدیلی کا تبدیل ہونا لازمی ہے۔ تبدیلی ایک سیلاب کی مانند ہے جسکی موجیں پتھر کی چٹانوں کو بھی جو ان کے راستہ میں حائل ہوتی ہیں اکھاڑ پھینکتی ہیں۔ قدامت پتھر کی چٹان سے مشابہت رکھتی ہے۔ انسانی سوسائٹی کا جو طبقہ تبدیلی کے سیلاب کی روانی میں قدامت کا پتھر بنکر حائل رہتا ہے از خود پاش پاش ہوجاتا ہے۔ وہ سیلاب کی روانی کو روک نہیں سکتا۔ وہ اپنے وجود کو تباہ کرلیتا ہے۔

ہندو سوسائٹی یا ہندو جاتی دنیا کی قدیم ترین اقوام میں سے ایک ہے مگر پھر بھی موجودہ زمانہ میں

جو پتھر اور لوہے کے زمانہ سے بہت مختلف ہے ہندو سوسائٹی کا وجود بدستور قایم ہے اس کا سبب ہندو سوسائٹی کی قدامت نہیں بلکہ تبدیلی پذیری ہے۔ ہندو تہذیب و معاشرت اور ہندو اخلاق و تمدن قدیم ہوتے ہوئے بھی زمانہ کی تبدیلی کے کبھی سدراہ نہیں ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ فنا و تباہ ہو جانے کی بجائے آج بھی بدستور موجود ہیں۔

ہندو سوسائٹی کا نقطۂ نگاہ زیادہ تر دینی رہا ہے۔ وہ خالص دنیوی معاملات کو بھی دینی نقطہ نگاہ سے دیکھنے کی عادی رہی ہے۔ حتّیٰ کی ہندو سوسائٹی کی زندگی بحیثیت مجموعی ایک دینی زندگی معلوم ہوتی ہے مگر دین و دنیا دو مختلف چیزیں ہیں۔ دونوں کا وجود اور دونوں کی نوعیت جدا جدا ہے۔ زندگی دونوں کے مناسب اختلاط سے ہی بن سکتی ہے ہندو سوسائٹی نے زندگی کے دنیوی پہلو کو قطعی نظر انداز کر دیا یہ راز ہے ان کمزوریوں کا جو آج ہندو سوسائٹی کی زندگی میں نظر آتی ہیں۔

ایک زمانہ تھا جب دنیا عالمگیر سلسلۂ خبر رسانی عالمگیر تبادلۂ خیالات۔ عالمگیر تعلقات۔ اور عالمگیر مقابلہ سے نا واقف تھی۔ اس زمانہ میں تخصیص و علیحدگی کو وصعت سمجھا جا سکتا تھا مگر اب تو یہ داخل عیب ہیں۔ ہندو سوسائٹی کو اب دنیا کی مختلف قوموں کے عالمگیر مقابلہ میں اپنے وجود کا جواز ثابت کرنا ہے۔ یہ قومیں خالص دینی نہیں بلکہ دنیوی بھی ہیں۔ کیا ہندو سوسائٹی اپنی ناقص و ناتمام زندگی کی حالت میں اس عالمگیر مقابلہ میں کامیاب رہ سکتی ہے یہ درست ہے کہ یہ قومیں قدیم ہیں بلکہ مقابلتاً نہایت جدید ہیں مگر یہ ایک حقیقت کا کہ ان قوموں نے زندگی کے دینی و دنیوی پہلوؤں کا ضروری تناسب بڑی حد تک سمجھ لیا ہے۔ اور اسلئے انکی زندگی زیادہ سرسبز و شاداب نظر آتی ہے انھیں قدامت کا شرف حاصل نہیں ہے مگر وہ تبدیلی و ترقی کے سانچہ میں ڈھلی ہوئی ہیں۔ کیا ہندو سوسائٹی محض اپنی قدامت اور اپنی دین پرستی کے بھروسہ پر اس عالمگیر مقابلہ میں کامیابی کی امید کر سکتی ہے۔ نہیں ہرگز نہیں۔ ہندو سوسائٹی کو آپ پھر اپنی تبدیلی کی قوت پر بھروسہ کرنا ہوگا جس نے اب تک اس کے وجود کو قایم رکھا ہے۔ ہندو سوسائٹی کو اپنی قدامت کو تبدیلی زمانہ سے مصالحت پر مائل کرنا پڑیگا۔ ہندو سوسائٹی کو زندگی کے متعلق اپنے نقطۂ نگاہ میں تبدیلی کرنی پڑیگی۔ ہندو سوسائٹی کو اپنی زندگی میں دین کے ساتھ دنیا کو مناسب جگہ دینی ہوگی۔ تب ہی اس کی قدامت اس کے لئے شرف و اعزاز کا موجب ثابت ہو سکتی ہے ورنہ فنا و تباہی کا باعث ہوگی۔

اگر یہ سچ ہے کہ ہندو تہذیب و معاشرت اور ہندو اخلاق و تمدن کو دنیا کے لئے کوئی پیغام دینا ہے اور اگر یہ سچ ہے کہ یہ پیغام عالمگیر اخوت ہے جسکا ہندو دھرم کو علم بردار سمجھا جاتا ہے تو ہندو سوسائٹی کو تخصیص و علیحدگی امتیاز و پابندی کو خیرباد کہنا پڑیگا۔ اور اگر دھرم شاشتروں کے احکام یا رسوم

ورواجات ایسا کرنے میں مانع ہیں تو اپنے وجود کو قائم رکھنے اور اپنے عالمگیر مشن کو پورا کرنے کی خاطر ہندو سوسائٹی کو اس قسم کے احکامات و سوتاکی اطاعت سے بھی منحرف ہونا پڑیگا۔ کیونکہ دھرم سوسائٹی کے لئے ہے۔ سوسائٹی دھرم کے لئے نہیں "۔ جہاں اعتقاد مضر ثابت ہوتا ہو وہاں عقل و دلیل سے کام لینا چاہئے کیونکہ دنیا کی ترقی بہرکیف اعتقاد سے نہیں بلکہ عقل و دلیل سے ہوئی ہے۔

خاص

ہندو سوسائٹی کی اصلاح

[پنڈت منوہر لال صاحب زتشی]

ہندو سوسائٹی کا رنگ ہزاروں برس سے ایک ساچلا آتا ہے مذہب میں اختلافات پیدا ہوئے اور اختلافات کا پیدا ہونا لازمی تھا۔ علاوہ بودھ مت اور جین مذہب کے جنھوں نے ویدوں کے احکام سے قطعی انکار کیا ہندو مذہب کے اندر درجنوں نہیں بلکہ سیکڑوں مت متانتر موجود ہیں ظاہر ہے کہ اگر کسی کتاب کو یا کسی کلام کو الہامی مان بھی لیا جائے تب بھی اس کتاب کی تشریح تو عقل انسانی کے ذمہ ہے اور اسی وجہ سے تشریح میں اختلاف ہونا لازمی ہے یہ کیفیت ہر مذہب میں موجود ہے عیسائیوں کے ایشیا یوروپ اور امریکا میں سیکڑوں گروہ ہیں جو ایک دوسرے سے الگ مذہبی اعتقاد رکھتے اسلام بھی بہتر فرقے ہیں۔ یا اس سے کچھ اور زیادہ۔ ہندو مذہب کا بھی یہی حال ہے ہاں ایک بات البتہ ہے جتنے مذہب ہندوستان میں پیدا ہوئے وہ سب تناسخ روح اور آواگون کے معتقد ہیں۔ ہندوں کے سوشل نظام پر بھی مذہب کا رنگ چوکھا ہے اور اسکی بنیاد دو خاص اصولوں پر ہے اوّل ذات کی تفریق اور دوسرے عورتوں کا مردوں کے ماتحت ہونا۔ اس وقت اس بحث کی ضرورت نہیں ہے کہ جس وقت یہ سوشل نظام قایم کیا گیا تھا اس وقت ان قواعد سے کیا فوائد مقصود تھے اور کس زمانہ میں ان سے کیا منافع پیدا ہوئے تھے دیکھنا یہ ہے کہ یہ اصول زمانہ حال کی رفتار کے کہاں تک مطابق ہیں اور بیسیویں صدی عیسوی کے جنگ وجہد میں کہاں تک ہمارے کام آسکتے ہیں۔

انیسویں صدی میں جب انگریزی سلطنت اور انگریزی تعلیم کے ذریعہ سے ہندوستان میں نئے خیالات پیدا ہونے لگے اس وقت ہندو سوسائٹی کی حالت منجمد سمندر کی سی تھی پچھلے ہزار برس میں اس سمندر میں کبھی کبھی اختلاف کی لہریں اٹھتی تھیں کچھ اس عقل و شعور کی بدولت جو انسان کی فطرت میں موجود ہے اور اسلام کے اثر سے۔ کبیر نانک۔ چیتن۔ تکارام یہ سب مذہبی پیشوا شارع عام سے ہٹ کر یہ تعلیم دیتے تھے کہ دنیا کا خالق اور مالک ایک ہے اور اس کی محنت اور اسکا عشق معیار زندگی ہے کرم کانڈ کے پیرو کہتے تھے مقررہ پوجا پاٹ کرنے سے نجات مل سکتی ہے۔ گیان مارگ والے بتلاتے تھے

کہ علم الٰہی کا حاصل کرنا نجات کے واسطے ضروری ہے مگر ان بزرگوں نے بھگتی یا عشق آلٰہی کو ان دونوں عقیدوں سے بہتر بتاتا اور یہ سکھلایا کہ اگر طلب صادق ہو تو طالب چاہے اونچی ذات والا ہو چاہے نیچ ذات والا چاہے عورت ہو چاہے مرد اپنا مقصد اور مطلب حاصل کرسکتا ہے ۔ اس تعلیم کا یہ اثر ضرور ہوا شمالی ہند میں تفریق ذات کی ویسی سختی نظر نہیں آتی جیسی جنوبی ہند میں مگر ذات کا اصول ٹوٹا نہیں اور ہندوؤں کا سوشل نظام اسی اصول پر قایم رہا ۔

انیسویں صدی میں جبکہ مغربی خیالات کے اشاعت سے ہندو سوسائٹی میں ہیجان شروع ہوا اور رام موہن رائے اور ودیا ساگر ایسے مصلحان قوم پیدا ہوئے تو ان کی نگاہ انہیں برائیوں کی طرف تھی جو ان دو عقیدوں سے ان کی سوسائٹی میں پیدا ہوگئے تھے ۔ انھوں نے یہ سکھلایا کہ اونچی ذات والوں کا غرور و تکبر اور نیچی ذات والوں کی ذلت دونوں قدرت کے اصول کے خلاف ہیں اور ہمدردی انسان کے منافی ۔ بیواؤں کی تکلیف اور مصیبت دیکھکر ودیا ساگر کا دل بھر آیا اور اس جوانمرد نے ساری عمر اس کوشش میں صرف کردی کہ ہندو سوسائٹی میں بیوہ کی شادی رائج ہوجائے اس کے بعد جب انیسویں صدی کے آخری ملک میں پولیٹیکل تحریک ملک میں شروع ہوئی تو علاوہ ہمدردی انسانی کے یک دوسرا خیال اصلاح کا محرک ہوا وہ خیال یہ تھا کہ نقائص اور عیوب کی وجہ سے جو ذات کی تفریق اور عورتوں کی جہالت اور بدقید کیلئے پیدا کردے ہیں ہندو

سوسائٹی ایسی کمزور ہوگئی ہے کہ وہ نئی دنیا کی جد وجہد میں ہرگز کامیاب نہیں ہوسکتی توپ بندوق کا مقابلہ تیر و تبر سے نہیں ہوسکتا اور نہ ایک پاشان اور پریشان بھیڑ قواعد دان فوج کا مقابلہ کرسکتی ہے ۔ یہی خیال ہے جس نے پرانے خیال کے ہندوؤں کو بھی اس بات پر مجبور کیا ہے کہ وہ لڑکیوں کی تعلیم کی طرف توجہ کریں بیواؤں پر بیجا سختیاں روا نہ رکھیں اور ہندو سوسائٹی کے جس بڑے گروہ کو وہ بزعم خود نیچ ذات والا سمجھتے ہیں اسکی خاطر مدارات اور دلدہی کی کوشش کریں۔ جن ہندوؤں نے غیر مذاہب قبول کرلئے ہیں وہ اگر پھر ہندو مذہب میں داخل ہونا چاہیں تو انکے راستے میں رکاوٹیں نہ پیدا کی جائیں ۔

اب وہ وقت نہیں ہے کہ ہندو سوسائٹی لکیر کی فقیر بنی رہے نہ اس سے کچھ فائدہ ہے کہ شاستروں کی جلدیں مصلحان قوم کے سر پر کھینچ ماری جاویں شاستر بنانے والوں نے اپنے زمانہ کے ضروریات کے واسطے اصول منضبط کئے اور قاعدے بنائے اب زمانہ بدل گیا ہے ہماری ضروریات دوسری ہیں دنیا بجلی کی رفتار سے ترقی کررہی ہے ۔ ہم کو محض وید اور شاستروں سے نہیں بلکہ اس عقل اور شعور سے کام لینا چاہئے جو خالق نے ہر انسان کو بخشا ہے ۔ اس روشنی سے اپنے دماغ کو منور کرنا چاہئے جس کا نام کانشنس یا ایمان ہے ۔ سوسائٹی کو قوی بنانے کا یہی ایک طریقہ ہے ۔

اور یہ نہیں تو باوا پھر سب کہانیاں ہیں ۔

خاص

جاپان میں تعلیم نسواں

[مسز ز۔ خ۔ سید، ایم اے]

جاپانی بچے تین سال کی عمر میں کنڈرگارٹن اسکول میں داخل ہو سکتا ہے۔ لیکن اس طرز کے اسکول چونکہ اس ملک میں بہت کم ہیں اسلئے اکثر بچے چھ سال کی عمر میں پرائمری اسکولوں میں داخل ہوتے ہیں۔ جس کے بعد عرصہ چھ سال تک انھیں اسکولوں کی حاضری پر مجبور کیا جاتا ہے۔ اس قاعدے سے صرف لولے، لنگڑے اور کمزور بچے مستثنیٰ ہیں۔ اسکولوں میں لڑکوں اور لڑکیوں کو یکساں تعلیم دی جاتی ہے۔ گو اکثر سہولیت کی غرض سے ان کی جماعتوں کو الگ الگ بھی کر دیا جاتا ہے۔ جو لڑکیاں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہتی ہوں وہ بارہ سال کی عمر میں تعلیم کے اس کورس کو شروع کرتی ہیں جو جاپان میں عورتوں کے لئے مخصوص ہے اور کسی اعلیٰ درجے کی پرائمری اسکول، سپلیمنٹری (ایزادی) اسکول یا لڑکیوں کے ہائی اسکول میں داخل ہو جاتی ہیں لیکن ان میں اکثر جو نہایت غریب اور ادنیٰ طبقے کی ہیں وہ مزید تعلیم کے فوائد سے محروم رہ کر کارخانوں چھاپہ خانوں وغیرہ میں محنت مزدوری کرنے لگ جاتی ہیں۔ یا گھر میں رہ کر مختلف طریقوں پر اپنے والدین کو مدد دیتی ہیں۔ مثلاً چھوٹے بچوں کی نگہداشت وغیرہ جنھیں وہ ایک کپڑے سے اپنی پیٹھ کے ساتھ باندھکر ہر وقت پھرتی نظر آتی ہیں۔

بڑے درجے کے پرائمری اسکولوں میں تعلیمی کورس عرصہ دو سال میں ختم کیا جا سکتا ہے۔ ان اسکولوں میں مضامین وہی ہیں لیکن کسی قدر ترقی یافتہ صورت میں ہوتے ہیں۔ مثلاً اخلاقی تعلیم، لوغت و خواندہ ستاہی جغرافیہ تاریخ، نقاشی موسیقی، جمناسٹک، سلائی۔ دستکاری وغیرہ بہت سی لڑکیاں اتنی تعلیم حاصل کرکے کام میں لگ جاتی ہیں لیکن بعض لڑکیوں کے ہائی اسکول، زنانہ کاریگروں کے مدرسہ، یا زنانہ نارمل اسکول میں پڑھنے کے لئے داخل ہو جاتی ہیں۔

آزادی اسکول تین قسم کے ہوتے ہیں۔ زراعتی، حرفتی اور تجارتی۔ ان میں سے ہر ایک میں عرصۂ تعلیم یکساں یعنے بقدر دو سال ہے۔ ان اسکولوں سے نکلتے ہی لڑکیاں اُن خاص کاموں میں مصروف ہو جاتی ہیں جنکی انھیں تربیت دی گئی ہو۔

خاص ملک جاپان میں لڑکیوں کے ہائی اسکول کی تعداد ۱۶۰ ہے۔ ان کا تعلیمی کورس عرصہ چار یا پانچ سال کا مقرر ہے۔ اور مضامین ذیل کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اخلاق، انتظام خانہ داری، کھانا پکانا، کپڑے دھونا، سلائی، تیمارداری، اور بچوں کی نگہداشت، غیر ملکی زبانیں (جن کے انتخاب کا اختیار طالب علم کو ہوتا ہے) جبر و مقابلہ اقلیدس، علم نباتات، علم حیوانات، علم موجودات نیچرل فلاسفی، علم کیمیا، نقاشی، موسیقی، خاص خاص مراسم کے موقعہ پر چائے دینا اور پھول سجانا وغیرہ وغیرہ۔ اس قسم کے اسکول چونکہ زیادہ تر بڑے بڑے شہروں اور قصبوں میں واقع ہیں۔ اسلئے دیہات سے آئی ہوئی لڑکیوں کے قیام کے لئے علیحدہ مکانات بنے ہوئے ہیں۔ ایسے اسکولوں کی طالب علم لڑکیاں زیادہ تر اوسط سے بڑا درجہ

رکھنے والے لوگوں کی ہوا کرتی ہیں۔ اور اچھے مالدار گھرانوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ رواجاً ان کی شادی کا انتظام ان کے گریجویٹ ہونے پر فوراً ہی کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح پر وہ جتنی بھی تربیت حاصل کرتی ہیں، وہ ساری عملی طور پر انتظام خانہ داری کے کام آتی ہی ہے۔ لیکن بعض لڑکیاں زنانہ نارمل اسکولوں یا زنانہ یونیورسٹیوں میں داخل ہو جاتی ہیں۔ جہاں انھیں استانیوں کی تربیت دی جاتی ہے۔ دونوں صورتوں میں انکا تعلیمی کورس ۳½ سال کا ہوتا ہے۔ ٹوکیو میں جو بڑے درجہ کا نارمل اسکول ہے اس میں لٹریچر، سائنس، اور آرٹ، ان تینوں میں سے کسی ایک کی تعلیم حاصل ہو سکتی ہے۔

لٹریری یا علمی کورس کے مضامین حسب ذیل ہیں۔ علم اخلاق، علم درس، جاپانی زبان، السنہ چینی، انگریزی، تاریخ جغرافیہ، موسیقی، اور جمناسٹک، سائنٹیفک کورس مضامین ذیل پر مشتمل ہوتا ہے:۔ علم اخلاق، علم درس، انگریزی، ریاضی، علم طبیعات، علم کیمیا، نیچرل ہسٹری، موسیقی، اور جمناسٹک، آرٹ کے کورس کی ذیل میں یہ مضامین آتے ہیں:۔ علم اخلاق، علم درس، انگریزی، علم طبیعات، علم کیمیا انتظام خانہ داری، خانگی تعلیم کپڑوں کی سلائی، دستکاری، نقاشی، نمونہ سازی، موسیقی اور جمناسٹک۔

زنانہ یونیورسٹی کے آٹھ مختلف شعبے ہیں۔ اور ہائی یا نارمل اسکولوں کے مضامین کے علاوہ یہاں مندرجہ ذیل مضامین کی بھی تعلیم ہوتی ہے:۔ علم موجودات، نیچرل، فلاسفی کی تاریخ، فنون لطیفہ کی تاریخ علم اللسان، آئین ملکی، اور ضابطہ دیوانی۔

اُمراء کے اسکول کی طرز پر ایک اسکول امیرزادیوں کے لئے قایم ہے لیکن اس میں عزت دار صاحب اقتدار عوام کی بیٹیاں بھی تعلیم حاصل کر سکتی ہیں۔ اسکے عملی طور پر چار مختلف حصے ہیں کیونکہ (معمولی) اعلیٰ تعلیمی) کورس دونوں جداگانہ طور پر دو دو چھوٹی اور بڑی جماعتوں پر مشتمل ہیں۔ اور انھیں پورا کرنے کے لئے عرصہ چھ سال کا مقرر ہے۔ تعلیمی مضامین اس جگہ بھی قریب قریب وہی ہیں جو زنانہ ہائی اسکولوں میں بطور نصاب مقرر ہیں۔

یہ سب انسٹی ٹیوشن، باستثنائے یونیورسٹی، گورنمنٹ کے زیر اقتدار ہیں۔ ان کے علاوہ اور بہت سے مشن اسکول قایم ہیں۔ جن کو اکثر گورنمنٹ جائز تسلیم کرتی ہے۔ اور جو معمولی طریقوں پر چل رہے ہیں چند پرائیویٹ انسٹی ٹیوشن انکے سوا اور ہیں جن میں سے ایک کسی جاپانی مس تسوڈا کا قایم کردہ اب تک چل رہا ہے۔ مخفی نہ رہے۔ کہ یہ عورت ان سات لڑکیوں میں سے ایک ہے جنھیں گورنمنٹ نے ممالک متحدہ (امریکہ) میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے بھیجا تھا۔

جاپان میں عورتوں کی تعلیم کا بنیادی اصول انھیں نیک بیبیاں اور مائیں بنانا ہے اور یہی ان کا فرض آسمانی خیال کیا جاتا ہے۔ یہ لوگ کنبہ کے خیال کو قومی اور سب سے اعلیٰ تصور کرتے اور شخصیت کو اہمیت سے بالکل بعید رکھتے ہیں بچپن ہی سے لڑکیاں

کو اطاعت گزاری کا عادی کیا جاتا ہے اور یہ بات اُنکے ذہن نشین کردی جاتی ہے کہ اپنے بھائیوں اور کنبہ کے دوسرے مردوں کے مقابلہ میں وہ دوسرے درجہ کی اہمیت رکھتی ہیں۔ تمدنی حالات لڑکی کو اس بات پر مجبور کرتے ہیں کہ اُس کے دوستانہ تعلقات صرف اسی کی جنس تک محدود ہوں۔ اور وہ بہت جلد سیکھ لیتی ہے کہ اپنے والدین کے انتظام کے بموجب اُسے بلا شکایت اپنی زندگی کو اپنے شوہر کی مرضی کے مطابق بسر کرنا چاہئیے شوہر کو لڑکیاں مشرقی دستور کے مطابق شادی کے دن سے پہلے بہت کم دیکھتی ہیں۔ سوائے مدبرانہ حلقہ کے شاذ و نادر ہی عورت اپنے شوہر کے ساتھ دستر خوان پر بیٹھتی یا مہمانوں کی دعوت میں شریک ہوتی ہے اور اگر ہوتی بھی ہے تو محض اسلئے کہ ان کے ضروریات کا خیال کرے۔ اسکا کام بالکل کنبہ کے حلقہ تک محدود ہوتا ہے اور اسکا فرض محض اسکی جسمانی ضروریات رفع کرنا خیال کیا جاتا ہے عام طور پر اُسے صرف امور ذیل میں مہارت ہوتی ہے۔ کوڈو کھیلنا (جو عملی طور پر سکھایا جاتا ہے۔ اور اس میں موسیقی سیکھنا ضروری نہیں ہوتا۔ موسیقی کا طریق تحریر حال ہی میں مروج ہوا ہے) پھولوں کو آراستہ کرنا اور نقاشی یا تصویر کشی، گو باوجود اسکے زنانہ طلبہ کو آرٹ اسکولوں میں داخل نہیں کیا جاتا۔

خاص

— • • —

غزل

[حضرت جگر بریلوی]

تھا پردۂ خود بینی جو ولولۂ دل تھا
جذبہ جسے کہتے ہیں اک جذبۂ باطل تھا

اللہ رے خود بینی کیا راز کھلا ہم پر
خورشید حقیقت بھی سرگشتۂ منزل تھا

تم نے ہی نہ سمجھا خود رونے کی حقیقت کو
آنکھوں سے مرے ورنہ جو قطرہ گرا دل تھا

عالم سا کوئی عالم تھا عہدِ جوانی بھی
ہر ذرۂ دل غم سے محشر کے مقابل تھا

کونین تھی جھولی میں تھے ہاتھ مگر خالی
وہ کون گدا تھا جو در پر ترے سائل تھا

دم توڑ دیا تھک کر کیا نیند اُسے آئی پھر
آزردۂ منزل بھی آسودۂ منزل تھا

خاموش ہوئیں شمعیں بیتاب تھے پروانے
کچھ ذکر جگر تیرا نکلا سرِ محفل تھا

شوخ چمارن

[پروفیسر کمار ایم اے]

شریف! ہاں اگر شریف صرف آسمان سے باتیں کرنیوالے مکانوں اور عالیشان کوٹھیوں کے رہنے والوں کو کہتے ہیں تو وہ بیشک شریف نہ تھی۔ اُسکے رہنے کے لئے مکان تو درکنار ایک معمولی جھونپڑا بھی نہ تھا۔ فرش خاکی اُسکا بچھونا اور کبودی آسمان اُسکا شامیانہ تھا۔ اگر شریف نقد و مال رکھنے والوں کو اور موٹر و فٹن کی سواریوں پر چلنے والوں کو کہتے ہیں تو اُسکے پاس اسقدر بھی پیسہ نہ تھا کہ اُس سے ایک دفعہ کے لئے اور محض ایک دفعہ کے لئے اپنے بچوں کے دوزخ شکم کا ایندھن مہیا کر سکتی۔ سواری کے لئے صرف پیر ہی اُسکی ثابت قدم سواری تھے۔ اگر صرف دوستوں کو روزانہ دعوت دینا۔ بال اور ڈانس میں شرکت کرنا اور بات بات میں انگریزی تہذیب برتنا یا اپنے بزرگوں اور ہمسروں کو "نالائق" اور "بیوقوف" کے الفاظ سے یاد کرنا ہی شریف (آدمی ہو یا عورت) ذات کے اوصاف ہیں تو شاید وہ شرافت سے کوسوں دور تھی۔ اسکے پاس اتنا سرمایہ کہاں تھا کہ وہ اپنے بیشمار دوستوں کو روزانہ دعوت دیتی وہ ایک پُرانے ڈھنگ کی ہندوستانی دیہاتی عورت تھی۔ انگریزی تہذیب تو دور انگریزی زبان ہی سے ناآشنا تھی وہ اپنے ہمسر اور بزرگوں کی خوشی میں اپنی خوشی سمجھتی تھی۔ اپنی زندگی کو صرف ایک مشت خاک ہی نہیں بلکہ اُنکے قدموں کی خاک سمجھتی تھی۔ اگر ریاکاری۔ خود غرضی و خود پسندی۔ خوشامد و کبر و نخوت وغیرہ ہی شرافت کی سندیں ہیں تو وہ بیچاری اُن سے فیضیاب ہونا کیا معنی کالے کوسوں دور تھی۔

مگر تاہم دل کہتا ہے کہ وہ شریف ہے حالانکہ وہ کسی چھتری یا برہمن کے گھر میں پیدا نہیں ہوئی تھی اور نہ اسکو یہ غرہ ہی ہے کہ میں "اعلیٰ خاندان کی لڑکی ہوں" مگر تاہم وہ ایک چمار کی لڑکی اور ایک چمار کی بیوی ہوکر بھی شریف۔ نہیں۔ شریفوں سے کہیں بڑھکر شریف ہے۔

وہ ہرگز اسبات کو گوارا نہ کرتی کہ محض اپنی جان بچانے کے لئے دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلائے۔ مگر اسکے شوہر اُس کوڑھی اور اپاہج شوہر کی پرحسرت نگاہیں۔

شریمتی راجلکشمی - ایل - ایم - پی
[ایروڈ (مدراس) میں آپ فرسٹ کلاس آنریری مجسٹریٹ مقرر ہوئی ہیں]

کماری تیجرانی دیکھچھت
[آپ لکھیم پور کھیری کے اصلاح پسند پنڈت سورج نارائن جی دیکھچھت ایم - اے ، ایل - ایل - بی کی شہزادی ہیں - کانکبج برہمنوں میں اتنی اولوالعزم اور تعلیم یافتہ لڑکیاں بہت کم نظر آتی ہیں]

شریمتی سلوچنا پکار بی - ایس -
اے - ایم (کولمبیا)
[آپ بڑودا کے لیڈی ٹریننگ کالج کی پرنسپل ہیں اور حال ہی میں بڑودا میونسپالٹی کی ممبر منتخب ہوئی ہیں]

مس چنار لکشمی جوشی ، ایم - اے

[آپ گورنمینٹ سے سکالرشپ پاکر والیت جا رہی ہیں]

شریمتی شنکر پلے

[ٹراونکور ہائیکورٹ کے ایکس جج مسٹر جی - شنکر پلے کی آپ بیوی ہیں اور حال ہی میں " مہلا - مندرم ایسوسیشن " کی میمبر چنی گئی ہیں]

مس فلس چانس

[آپکو موسیقی سے دلچسپی ہے ، آپ نے والیت کی رائل اکیڈیمی آف میوزک کا امتحان حال ہی میں پاس کیا ہے]

بچوں کی بلبلاہٹ اور چیخ پکار۔ مادری شفقت و محبت
کا جوش ان سب باتوں نے اسکو مجبور کر دیا تھا۔ کہ وہ
اس بنگلے پر دو ٹکڑے روٹیوں کے لئے اپنے لئے نہیں
بچوں کے لئے سوال کرنے آئے۔ نوکروں نے اسکے بھگانے
کی کوشش کی مگر وہ اُس جگہ سے ٹلنے والی کب تھی۔ وہ
دست سوال پھیلانے کی عادی نہ تھی۔ بھیک مانگنا اُسکا
شیوہ نہ تھا۔ اور نہ وہ اسکو اکتساب معاش کا آسان
وسیلہ ہی سمجھتی تھی اسکا سوال رد کرنا اسکی گردن مارنے
سے کم نہ تھا۔ وہ سوچ چکی تھی بلکہ مصمم ارادہ کر چکی تھی
کہ اگر یہاں بچوں کے پیٹ پالنے کا کچھ سہارا ہو گیا تو
بہتر ورنہ یہاں سے خالی ہاتھ جاکر دوسرے سے استدعا
کرنا اسکے واسطے جہنم میں جانا ہوگا۔ اسکی غیرت تقاضا
کرتی تھی کہ دیو اشتہا کا شکار ہو جانا مگر پھر زبان نہ
ہلانا۔ اسلئے اُس نے نوکروں کی ایک بھی نہ سنی اور
کہدیا "سرکار سے کہبر (خبر) کر دیو"۔

سرکار! اوہ سرکار تو مجسم سرکار تھی جسم ماشاءاللہ
کافی سڈول تھا۔ لمبائی اور چوڑائی میں کچھ زیادہ
فرق نہ تھا ایسا معلوم ہوتا تھا گویا وسعت کا میدان
مارنے کے لئے لمبائی اور چوڑائی نے کمر باندھی ہے
کہ ہم کسی سے پیچھے نہ رہینگے۔ شاید اسی باہمی شرط
و مقابلہ کی وجہ سے اس شریف شکم نے کمر کو بالکل
سوراج کا حق دے دیا تھا اور جملہ قیود یعنی سونے
چاندی یا چمڑے کی زنجیروں کے حدود سے بالکل
باہر کر دیا تھا۔ عمدہ ریشمی ساڑی زیب بدن تھی۔
زیورات کو کالے پانی کا حکم تھا مگر انگوٹھیوں پر زور
نہ چل سکا اسلئے اُنھوں نے ہاتھ روک لیا تھا۔ پیروں
میں قیمتی اونچی ایڑی والا "لیڈی شو" تھا جو فتنہ انگیز
تو نہیں۔ ہاں شور انگیز رفتار کا بیشک بانی تھا۔
یا یوں کہو کہ اپنی بدقسمتی کی کہانی قدم قدم پر کہتا
اور داد چاہتا تھا۔ چہرہ اسقدر گول اور سڈول تھا
کہ اگر خدا نے اپنے ہاتھوں ہی بنایا ہوگا تو بھی شاید
پرکار کی ضرورت محسوس ہوئی ہوگی اسکے اوپر نہایت تیز
اور چمکیلی آنکھیں۔ اگرچہ بہت بڑی نہ سہی مگر تاہم
مشعل کی طرح روشن تھیں۔ بھوئیں نہایت باقاعدہ
کمان کی طرح چڑھی ہوئیں گویا کسی نومشق پینٹر (مصور)
نے برش و روشنائی سے کافی مشق کی ہو۔ ہونٹ اسقدر
چوڑے تھے کہ انکی تشبیہ صرف بنگالی دھوتیوں کے
کنارے سے دیجا سکتی ہے۔ ہونٹوں کی جنبش و حرکت
سے شاذ و نادر دودھ کے مانند سفید چوڑے چوڑے
دانت بھی بجلی کی طرح چمکتے تھے۔ ناک کے بنانے میں
شاید خدا نے کچھ کوتاہی کی تھی یا جلدی سے کام لیا
تھا کہ مقررہ و موزوں لمبائی تک نہ پہونچکر اُس نے
نتھنوں کو کافی اجازت دیدی کہ جسقدر ہوا کا استعمال
کرنا چاہیں کر سکتے ہیں۔ رنگ نہایت ملیح صاف و چکنا
سب رنگوں کا راجا پکا رنگ تھا۔ خمدار گیسوؤں کی
ہمدردی اور انکو چھپانا اُسی کا کام تھا۔ آپ کو جب
غصہ آتا تو ایک عجیب عالم ہوتا تھا۔ پیشانی پر شکن
ہونٹوں کی جنبش اور انکے متواتر تھپیڑے۔ چہرہ پر ایک
خاص قسم کی سُرخی۔ آواز کا لہجہ و انداز۔ یہ سب ملکر
ایک منظر پیش کرتے تھے جسکو زمانۂ حال کے نقاش و مصور

تو کیا زمانۂ ماضی کے ماہر دانتوں انگلی داتے اور قلم اُٹھانے کی جسارت نہ کرتے۔

اس وقت یہی کیفیت تھی۔ یہی سماں تھا جسکا بیان قلم کی قدرت سے بعید ہے وہ اس وقت انگریزی ناول پڑھنے میں مصروف تھیں کہ نوکروں کی ہم ہم۔ گلخپ ہنسی مذاق اور کسی عورت کی ضد اور اسکا آخری کلمہ "سرکار سے کمبر...." سنائی پڑا۔ اسوقت وہ کچھ ناخوش سی تھیں ہی (خدا معلوم کیوں؟) کہ ایک بڈھے اور کوڑھی چمار اور اسکے ساتھ دو ننھے ننھے گندے چیتھڑے لپیٹے ہوئے بچے اور ایک عورت دیکھکر اُن کے غصہ کا ٹھکانا نہ رہا۔ گرمی کا پارہ فوراً اوپر چوٹی تک پہنچ گیا۔ کوٹھی کے برآمدہ میں نکلکر کہا "کیا ہے؟ گھسیٹے! ان لوگن (لوگوں) کو ہٹاؤ"

گھسیٹے نے عرض کیا "حضور یہ عورت مانتی ہی نہیں۔ کہتی ہے بچے چار چار دن کے بے دانہ پانی پڑے ہیں"

"تو ہم کیا کرے، ہم نے ٹھیکا نہیں لیا ٹھوکر مارکر نکال دو"

سائل نے آگے بڑھکر درخواست کی "سہجور ہم بھیک ناہیں مانگت ہیں۔ آج دکھ پڑا....."[1]

سرکار نے گرج کر کہا "بھیک نہیں کیا تنخواہ مانگتا ہے؟ اسکی چوٹی پکڑ کے نکالو۔ گندہ عورت....."

گھسیٹے کی ہمت نہ پڑی۔ شاید اُسکے دل میں رحم کا دریا موجزن تھا۔ اس نے عورت سے مڑکر کہا "دیکھو میم صاحب کتنی ہی یہاں سے چلی جاؤ۔ ناخوش ہو رہی ہیں"

عورت خاموش ہوگئی۔ اُس نے اپنے چھوٹے بچے کو گود میں اٹھالیا اور اپنے شوہر کے ہاتھ میں لاٹھی دیکر کہا "چلو۔ پرمیسور کا یہی منجور (منظور) ہے" بچوں کو جب یہاں سے جواب مل گیا اور نا اُمیدی ہوگئی تو بلک بلک کر رونے لگے۔ دونوں نے کہرام مچادیا۔ بڈھے سے بھی نہ رہا گیا۔ اُس نے بھی ایک ڈہاڑ مار ی۔ عورت کا سینہ بھی آخر پتھر کا نہ تھا پسیج گیا اور آتش غم کو بجھانے کے لئے آنکھوں کے راستے سے دریا بہ نکلا۔ اُس غریب کے لئے یہ مصیبت ہی کیا کم تھی کہ جو اس میں اضافہ کرنے کی غرض سے میم صاحب نے دوڑ کر اس مجبور و لاچار بڈھے کے ایک ٹھوکر رسید کی "اُلو۔ گدھا۔ جال پھیلاتا ہے...."

عورت جھپٹ کر دونوں کے درمیان آگئی اور ہاتھ جوڑ کر منت کی "بہت بوڑھے ہیں۔ کمجور (کمزور) ہیں"

"اچھا تو جوان ہے لے۔ لے۔ اور۔ اور۔ اور۔"

(۲)

رائے صاحب مسٹر کامتا پرشاد کوئی معمولی آدمی نہ تھے۔ درجہ اوّل کے ڈپٹی کلکٹر تھے۔ نو سو روپیہ ماہوار تنخواہ پاتے تھے۔ نہایت شاندار اور دلفریب کوٹھی میں رہتے تھے عمدہ سے عمدہ موٹر سواری میں تھا۔ نصف درجن سے کم نفر خدمت کے لئے بھی نہ تھے۔ مجسٹریٹی کے اعلیٰ حقوق حاصل تھے۔ اپنی یاد میں شاید انھوں نے کبھی ایسا مقدمہ بھی نہ کیا تھا جس میں مجرم کو ۱ سال سے کم کی سزا دی ہو۔ انکا خیال اور نہایت درست خیال تھا کہ اگر ایسی سختی سے کام نہ لیا جائیگا تو احتمال یہ ہے کہ مجرموں کی تعداد ہر سال ترقی کرتی رہے۔ مگر ہم

---

[1] حضور میں بھیک نہیں مانگتی (ہندی)

اس عملدرامد سے وہ اپنے منشا میں کہاں تک کامیاب ہوئے یہ وہی کہہ سکتے ہیں۔ سرکار دربار۔ کورٹ و کچہری۔ افسروں وحکاموں میں انکا پورا رعب وداب تھا۔ بڑے بڑے اکثر فوں اُنکے سامنے آتے ہی چوکڑیاں بھول جاتے تھے۔ زبان لکنت کرنے لگتی تھی۔ مگر تاہم بقول شخصے ہر فرعونے راموسیٰ۔ ہر شخص کو کسی نہ کسی سے دبنا ضرور پڑتا ہے چنانچہ وہی ڈپٹی صاحب جو کچہری کے میدان کارزار میں رستم وارجن کے کان کاٹتے تھے بنگلے میں قدم رکھتے ہی میم صاحب کے سامنے بھیگی بلی ہو جاتے تھے کیونکہ یہاں کی ڈگری کی تو اپیل ہی نہیں ہو سکتی۔ یہاں تو جرح کرنے کا موقع ہی دستیاب نہیں ہوتا زبان کھولنا ہی گویا کورٹ کی توہین میں داخل ہے۔

میم صاحب درحقیقت کوئی ولایتی میم صاحب نہ تھیں۔ ہندوستان ہی میں پیدا ہوئیں اور یہیں نشو و نما پائی۔ تعلیم وتربیت کا سہرہ لکھنؤ کے تھابرن کالج کے سر رہا۔ ایف۔اے کا امتحان بھی وہیں سے پاس کیا تھا۔ اسکے بعد وجوہات چند در چند کی وجہ سے آگے قدم بڑھانا بیکار سمجھا اور اسی پر اکتفا کی حالانکہ یہ انکی ہمیشہ ایک حسرت ہی رہی کہ "ایک دفعہ انگلینڈ کی سیر کرلوں اور پھر دیکھوں کہ کس کا منہ ہے جو میرے سامنے زبان کھول سکے اور انگریزی زبان میں گفتگو کر سکے کیونکہ ہندی زبان سے چنداں محبت نہ تھی۔ مگر یہ خدا کا فضل وکرم سمجھئے یا انکے حق میں گستاخی کہئے کہ اُس نے گنجے کو ناخون نہ دئے" میم صاحب اگرچہ بادی النظر میں حضرت عیسیٰ کے زیر سایہ نظر آتی تھیں مگر درحقیقت وہ ہندو اور کٹر ہندو گھرانے کی لڑکی تھیں۔ اس میں شک نہیں کہ انکی تعلیم چونکہ مغربی اصول پر مبنی تھی اور وہ اپنے باپ کی اکلوتی لاڈلی بیٹی تھیں کوئی دخل اندازی پیدا کرنے والا دنیا میں پیدا ہی۔ ہوا تھا۔ اسلئے وہ جو مناسب سمجھتی تھیں کرتی تھیں۔ باپ نے ہمیشہ یہی کوشش کی کہ بیٹی کے خلاف مرضی ہرگز کوئی بات وقوع میں نہ آئے۔ مگر تاہم وہ اس بات کو گوارا نہ کر سکے اُسکی شادی انٹرنس پاس کرنے کے بعد بھی ملتوی رکھی جائے۔ چنانچہ ایک نہایت ممتاز خوبصورت اور تیز طبع ایم۔اے کلاس کے لڑکے سے شادی کردی جو کہ اب ایک نامور ڈپٹی کلکٹر ہیں اسلئے یہ خیال کرنا کہ ڈپٹی صاحب اور میم صاحب کی شادی "ازدواج محبت" کا ایک نمونہ تھی سخت غلطی ہے۔ میری سمجھ میں تو یہ آتا ہے کہ اس حالت میں تو میم صاحب بھی کچھ مجبور تھیں ورنہ ایک ہندوستانی آدمی کے ساتھ رشتہ زندگی باندھنا گویا انکو قعر مذلت میں ڈھکیلنا تھا۔ ڈپٹی صاحب بیچارے اونچی ذات چاہے راضی بھی ہوگئے ہوتے مگر میم صاحب جو کہ اس وقت "مِس چمپا" تھیں ہرگز اس دنیاوی ڈھکوسلہ کو جائز نہ رکھتیں۔

خیر یہ تو بہت پُرانے واقعات ہیں جنکی یاد سے شاید دونوں شریف ہستیوں کے دل پر سانپ لوٹ جاتے ہونگے اسلئے میں ان خیالات ناکارہ سے انکے دماغ کو (اگر وہ اس وقت سنیں یا پڑھیں) پراگندہ نہیں کرنا چاہتا۔ کیونکہ میم صاحب۔ مسٹر شاہدت میں اور مسٹر لانگ میں۔ مسٹر گرین اور مسٹر براون۔ مسٹر فاکس

وسٹر ٹام وغیرہ کی سوسائٹی میں جکی کہ اکثر اُنکے گھر پر دعوت
ہوا کرتی تھی ان فرسودہ اور دیرینہ خیالات کو دل میں
آنے کا موقع ہی نہ دیتی تھیں اور ادھر بیچارے ڈپٹی
صاحب کو کچہری کے بیشمار و لامحدود کاغذی بنڈل
مسلیں واحکامات سے اسقدر فرصت ہی نہ ملتی تھی
کہ وہ اپنے دماغ کو بیکار امور میں مشغول ہونے کی
مہلت دیتے۔ ہاں کبھی کبھی صبح وشام میم صاحب
کے ساتھ تفریح طبع کے لئے نکل جاتے تھے ورنہ میم
صاحب کے ذاتی امور وسائل میں دخل انداز ہونا
اُنکا شیوہ نہ تھا۔

مگر اسوقت وہ کوٹھی کے سامنے مہا بھارت دیکھکر
حیران تھے۔ انھیں بخوبی معلوم تھا کہ کوئی شخص اتنی
جراءت نہیں کرسکتا کہ انکے بنگلے پر آئے۔ پھر یہ گولہ
باری کیوں اور کیسے شروع ہوئی؟ وہ فوراً نکل کے
باہر آئے اور دیکھتے ہی انگریزی زبان میں کہا ڈیر چپا۔
یہ کام تمہارے لائق نہیں،،

جواب ملا زبان رد کے رہو۔ بیچ میں مت کودو
یہ کچہری نہیں ہے،،

ڈپٹی صاحب نے مسکراتے ہوئے ٹال کر کہا "یہاں
کچہری کا کیا سوال؟ مگر بھکاریوں کو مارنا.... تو اچھا
نہیں" میم صاحب نے کہا "تم کو ہر جگہ گدھے کی طرح
دانت نکالنا آتا ہے۔ یہ بہت اچھا ہے۔ کیوں؟"
ادھر باہمی سلامی دغی تو ادھر ان غریبوں کو بارے فرصت
ملی۔ مگر جب یہ چلنے کو تیار ہوئے تو اُدھر بھی صلح ہوگئی
تھی ڈپٹی صاحب نے حسب معمول بخوشی شکست
منظور کرلی تھی۔ اب انھوں نے آکر اُس چمار سے پوچھا
ابے تو بھیک کیوں مانگتا ہے؟ کچھ کام کیوں نہیں کرتا؟
مگر جب اسکے مہلک امراض اسکی عمر اور خراب وخستہ
حالی پر نظر ڈالی تو خود خاموش ہو رہے۔ پھر اس عورت
سے مڑکر پوچھا "یہ تیرا باپ ہے؟" جواب ندارد۔ پھر
پوچھا کیا یہ تیرا شوہر ہے؟" عورت نے آگے سر ہلاکر
اشارہ سے کہہ دیا کہ "ہاں"

ڈپٹی صاحب نے سوچا کہ آدمی بالکل بڈھا نحیف
ولاغر۔ مریض اور موت کے منہ میں ہے اور عورت تو
صرف پچیس یا چھبیس برس ہی کی ہوگی،، وہ اگرچہ پھٹے
پُرانے اور میلے کچیلے کپڑے پہنے ہوئے تھی مگر کافی
جمیل وشکیل۔ تندرست و توانا۔ ہٹی کٹی اور مضبوط تھی
اسکے لئے اگر "گدڑی میں لال" کہا جاتا تو نازیبا نہ تھا۔
ڈپٹی صاحب کو سخت تعجب ہوا کہ "یہ عورت اب بھی
اس زندہ درگور شخص کے ساتھ ہے۔ کسی دوسرے
چمار سے شادی کیوں نہیں کرلیتی خصوصاً جبکہ اُنکے
یہاں یہ بات ممنوع نہیں۔ ہماری ڈیر چپا تو جس
روز ناخوش ہوجاتی ہیں ایک طوفان برپا کر دیتی ہیں
قطع تعلق مقدمہ بازی اور عزت ہتک کی سیکڑوں
دھمکیاں دیتی ہیں ہفتوں باہر دوستوں کے ساتھ رہتی
ہیں۔ اور خوشامد کرنے پر بمشکل تمام واپس آتی ہیں اگر
اگر ہم لوگوں میں اس قسم کی شادی جائز ہوتی تو ڈیر چپا
اسکی اوّل مثال ہوتیں" دماغ میں یوں ہی مختلف
خیالات چکر لگا رہے تھے۔ انھوں نے پھر پوچھا "تو اسکو
چھوڑکر دوسرے کے گھر کیوں نہیں بیٹھ جاتی؟ اس کو

چھوڑ۔ اس کو مرنے دے ہمیشہ کی جھنجھٹ"
عورت نے آنسو پونچھ ڈالے۔ اس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ چہرہ تمتما گیا۔ ایک دفعہ تیور بدلکر گھور کر اُنکی طرف دیکھا اور خاموش ہورہی۔ معلوم ہوتا تھا غصہ کو پی گئی ہے۔ اور کر ہی کیا سکتی تھی! قہر درویش بر جان درویش۔ بعدہٗ اپنے پیارے شوہر کو لاٹھی کے سہارے کھڑا کیا۔ ایک ہاتھ اسکی کمر میں ڈال دوسرے ہاتھ کی انگلی ایک ننھے بچے کو کو دیکر اور چھوٹے بچہ کو کندھے پر ڈال کر وہ آہستہ آہستہ چلدی اور منہ پھیر کر نہایت دھیمی آواز میں کہا ڈپٹی صاحب! ہم لوگ گریب ہیں جرور۔ مگر ایسا نہ کہو۔ یہی دھرم ہمار سب کچھ ہے"[۱]

(۳)

اس سرائے فانی میں ہر شخص کسی نہ کسی مصیبت میں ضرور مبتلا ہے۔ کیونکہ یہاں جو چیز ایک شخص کے لئے باعث آرام وانبساط ہے ممکن ہے دوسرے کے حق میں وہی زہر قاتل ہو۔ ہوا جو کہ شمع کی زندگی کو ہمیشہ موت کا پیغام دیتی رہتی ہے آگ کے شعلہ کو اسقدر بھڑکاتی ہے کہ گاؤں کے گاؤں تباہ وخاک وسیاہ ہوجاتے ہیں۔ وہی ہوا جو کہ مچھلیوں کی ایک منٹ کی بھی مہمان نوازی نہیں کر سکتی تمام اشرف المخلوقات کی زندگی کا سرمایہ ہے۔ اسی طرح تندرستی وصحت جو کہ غریبوں کے بن بلائے مہمان ہیں امیروں کے پاس بمشکل تمام پھٹکتی ہیں۔ غریبوں کو خدا خدا کرکے ایک دفعہ دن کی محنت کے بعد کھانا بلکہ روکھا سوکھا کھانا نصیب ہوتا ہے۔ بھوک ہمیشہ گردن پر سوار رہتی ہے اور امیروں کی یہی کوشش رہتی ہے کہ کسی طرح سے یہ کھانا سوڈا واٹر۔ چورن یا طلاج وغیرہ سے ہضم کیا جائے اور بھوک بلائی جائے۔ چنانچہ اسی کے واسطے بہت سی ترکیبیں عمل میں لائی جاتی ہیں جن میں ہوا خوری یعنی صبح وشام ٹہلنا اعلیٰ ترین اصول سمجھا جاتا ہے ہمارے بنگالی ڈاکٹر امرناتھ متّرا اور اُنکی بیوی اس قاعدے کے محض مدّاح ہی نہیں بلکہ سخت پابند ہیں۔ صبح ہوئی اور ٹہلنا شروع کردیا اور پھر کہیں ۹ بجے گھر واپس آتے۔ ہاتھ میں ایک پڑیہ جس میں شاید شکر اور آٹے کی آمیزش ہو ہر وقت موجود رہتی ہے۔ جہاں کہیں چیونٹیاں نظر آئیں بس ٹھہر گئے اور ذرا سا تحفہ اُنکی نذر کردیا۔ اگر اس وقت کوئی فقیر معذور بھی سامنے آجاتا تو اسکو بھی محض زبان سے نہیں بلکہ کچھ نقد سے تسکین دیدیتے تھے۔ یہ تو انکا معمول تھا۔ اُنکی بیوی نہایت پاک طینت شریف اور رحمدل تھیں۔ کسی کو مصیبت میں دیکھتیں تو انکا دل بھر آتا۔ رحم کا دریا موجزن ہوجاتا۔ چنانچہ اسکا ثبوت آج بھی اُنھوں نے دیا۔

اسوقت ایک عورت دو ننھے ننھے بچوں اور ایک ضعیف وناتواں پیر مرد کے ساتھ انکے سامنے دریائے الم میں غوطے لگا رہی تھی بنگلہ ڈپٹی صاحب کا تھا اسلئے انھوں نے خیال کیا کہ شاید کوئی مقدمہ تھا

[۱] ہم لوگ غریب ضرور ہیں مگر یہی دھرم ہمارا سب کچھ ہے۔

جس میں کسی کو سزا ہوگئی ہوگی یا اسی قسم کی کوئی دیگر بات ہوئی ہوگی جس نے ان لوگوں کو مصیبت کے کنوئیں میں ڈھکیل دیا ہے۔ مگر قریب آنے پر معاملہ کھلا ان کو اُن معذوروں کی حالت پر بہت ترس آیا۔ دریافت کرنے پر یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ ننھے ننھے بچے کئی دنوں کے فاقوں سے ماں کے پیٹ سے لگے رہ کر زندگی کے دن پورے کر رہے ہیں۔ اُن کا دل بے قابو ہوگیا۔ انکے ابھی تک کوئی اولاد نہ ہوئی تھی مگر اُنکا کلیجہ یہ دیکھکر ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔ فوراً باورچی سے کہا کہ کچھ ہو تو ان کو دیا جائے جس سے ان کی جان بچے۔ مگر بدنصیب پیاسا اگر کنوے کے پاس جائے تو پانی بھی خشک ہو جاتا ہے۔ اس وقت اتفاق سے بابو صاحب کی بھی جیب خالی تھی۔ ایک پیسہ بھی نہ نکلا۔ اب کیا تھا۔ مجبوری تھی مگر انھوں نے پھر سوچکر کہا "اچھا ہمارے ساتھ چلو"

وہ عورت ہرگز راضی نہ ہوتی تھی۔ اب اسکو بڑے بڑے اور شریف آدمیوں کا اعتبار نہ تھا۔ وہ بھیک مانگنے اور خیرات لینے کو عار سمجھتی تھی مگر اس وقت تو لاچاری تھی اور پھر ایک ایسے ہمدرد کا اصرار جو حقیقتاً انکے دکھ میں شریک معلوم ہوتا تھا۔ انکار کیونکر ممکن تھا۔ خدا معلوم کن دقتوں سے ایک میل کا سفر جوکہ اسوقت پہاڑ کی سخت چڑھائی اور گہری گھاٹیوں کے سفر سے بھی زیادہ دشوار تھا۔ طے ہوا ہوگا۔ مکان پر پہونچتے ہی بابوجی کو خبر ملی کہ نوکر اور باورچی میں معرکہ گرم ہو جانے کی وجہ سے مہاراج جی فرار ہوگئے ہیں۔ کھانا تیار ہوتا کیا معنی ابھی اُس کی شروعات بھی نہیں ہوئی۔ گھر میں کوئی بال بچے تو تھے نہیں۔ میاں بیوی یوں سرگشتی میں وقت کاٹتے تھے۔ آج تو خلاف معمول دیر بھی ہوگئی تھی۔ ۱۰ بج چکے تھے۔ انکی بیوی نے اظہار افسوس کیا۔ سخت نادم ہوئیں کہ اپنے سامنے اپنے ہاتھوں بچوں کو کھلا نہ سکیں مگر اسکا کفارہ اس طرح ادا کیا کہ اندر جاکر ایک دہوتی لائیں اور ایک روپیہ مع دہوتی اُس عورت کے ہاتھ میں دیکر کہا "ابھی جاکے پہلے بچوں کو کھلا دو۔ پھر دوسرا کام کرنا" عورت نے بہت بہت انکار کیا کہ "ایک روپیہ بہت ہے" مگر وہاں سُنتا کون تھا۔ اسکو مجبوراً قبول ہی کرنا پڑا۔ عورت وہاں سے روانہ ہوگئی۔ اسکے منہ میں قفل لگ گیا تھا۔ وہ بالکل خاموش تھی۔ شاید اسکا دل دعائیں دیتا ہوگا۔

دوسرے ہی روز ایک ادھیڑ اور خوبصورت عورت نہایت صاف و نفیس دہوتی پہنے ہوئے رانپی، کٹری، سوئی۔ تاگا۔ موم و چمڑے کے ٹکڑے وغیرہ جملہ موچیوں کا سامان لئے ہوئے کچہری کے چبوترے پر بیٹھی ہوئی نظر آنے لگی۔ دس پانچ آدمی خصوصاً پولیس کے لوگ پھٹے پُرانے جوتوں کو نئے کرانے کی فکر میں موجود تھے۔ رفتہ رفتہ نوبت بایں جا رسید کہ صاحب لوگوں کے تمام خدمتگار بیرا لوگ بھی اسی جگہ سے جوتوں کی مرمت کرانے لگے۔ کچہری کے ہرکاروں اور محرروں کے جوتوں کی کیلیں بھی بہت جلد جلد نکلنے لگیں۔ تلے گھسنے اور ٹوٹنے لگے اور

شاید سب سے اچھی مرمت بھی اسی جگہ ہونے لگی بہرکیف اب اس عورت کی آمدنی روزانہ اسقدر ہونے لگی کہ وہ معہ بال بچوں اور اپنے معذور و مجبور شوہر کے بآرام کما پی سکے اور کچھ نہ کچھ پس انداز بھی کرسکے۔ بچوں کے بدن پر بھی کپڑا دکھلائی پڑنے لگا۔ وہ بڈھا بھی تھوڑے عرصہ ہی میں رنگ بدلنے لگا چلنے پھرنے کی طاقت ہوئی تو کام میں بھی ہاتھ بٹانے لگا اور بیٹھے بیٹھے دو چار پیسے بھی پیدا کرنے لگا۔ بہرصورت اب وہ ڈاکٹر امرناتھ کی مہربانی سے اس قابل تھا کہ دنیا میں پیر پھیلا سکے۔ اب وہ دیکھنے میں اسقدر بوڑھا بھی نظر نہیں آتا تھا جتنا کہ پیشتر۔ یہ سب محنت اور پیٹ بھر کھانے کی برکت تھی۔

(۴)

میں یہ نہیں کہتا کہ وہ دنیا کی نظروں میں نیچ قوم اور ذلیل نہ تھی۔ وہ چمار کے گھر میں پیدا ہوئی تھی اسکو کیونکر مٹا سکتی تھی مگر اسکا دل سمندر تھا۔ وہ احسان فراموش نہ تھی۔ سچ کو جھوٹ کہنا اور ظلمت کو نور بتلانا اُسکی عادت میں داخل نہ تھا ا۱۲ سال تو کیا اگر ڈیڑھ سو برس بھی گذر جاتے تو بھی وہ اپنے محسن کو بھولنے والی نہ تھی۔ اُٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے اسکا دل۔ نہیں۔ اسکا بال بال اپنے محسن کو دعائیں دیتا تھا۔ جسنے اسکی زندگی کی ایک کٹھن منزل کو آسان کر دیا تھا۔ ڈوبتے کو بچایا تھا اُسکو بھلا وہ اس زندگی میں کیونکر بھول سکتی تھی۔ خدا نے اسکو بھی موقع دیا کہ وہ اپنے دل کے ارمان نکالے۔ احسان کے بوجھ کو ہلکا کرے۔ آج اُسکے دل کی ہوس پوری ہوئی۔ بابو امرناتھ مترا کو پرمیشور کی کرپا سے شادی کے بارھویں سال لڑکے کا منہ دیکھنا نصیب ہوا۔ آج اُسکا اَن پراسن تھا۔ اس میں اس نے اپنے ہاتھوں دس روپیہ کے پیسے اور اکنیاں نچھاور کیں اور امرناتھ بابو اور اُنکی بیوی کے لئے ایک ایک جوڑ جوتہ نذر کیا۔ بابو صاحب نے اسکا معاوضہ اور صلہ دینے کے لئے بہت اصرار کیا۔ ضد کی مگر اسکے آگے پیش نہ گئی۔ آج اسکی خوشی کا اندازہ کرنا محال تھا۔ دیکھنے والے حیران تھے کہ یہ ماجرا کیا ہے۔ امرناتھ بابو کے منہ سے کوئی جواب ہی نہ نکل سکا۔ مگر اس نے سب کے روبرو آکر کہہ دیا "یہ سب حضور ہی کا پیسہ ہے۔ ہم ان کے گلام (غلام) ہیں" لوگوں نے حسب خواہش و مرضی معنی لگائے مگر بابو صاحب اور اُن کی بیوی کا پاک دل کہہ رہا تھا یہ ہے شرافت"

آج اسکو کچھ دیر ہوگئی تھی۔ دوکان پر صرف دونوں بچے موجود تھے۔ واپس آنے پر معلوم ہوا کہ یہ بیچارے غریب عیسائی (صاحب) بڑی دیر سے اُسکا انتظار کر رہے ہیں وہ بھی اپنے جوتوں کے لئے نہیں بلکہ کسی دوسرے شخص کے جوتوں کے لئے۔ کیونکہ وہ جو ایک لیڈی شو" تھا عورت نے جوتے کو ہاتھ میں لیا بغور دیکھا اور پوچھا "یہ جوتہ کہکا (کسکا) ہے؟" جواب ملا "مسز چمپا کا" اُس نے پھر جوتہ کی طرف متعجب ہوکر دیکھا اور اُس سے پوچھا "تکا (کیا) تم نوکر ہو؟" اُس نے جواب دیا۔

"اخاہ۔ ہم اور اُسکا نوکر۔ وہ ہمارا میم صاحب ہے"

عورت کا چہرہ فق ہوگیا۔ اُسکی سمجھ میں یہ بات

نہ آئی۔ اسی کشمکش و پیچ میں اُس نے کہا "ایسا نہ کہو۔ وہ لوگ بڑے آدمی ہیں" اسکے جواب میں ایک داستان کا آغاز ہوگیا۔ جسکا نفس مطلب یہ تھا کہ ڈپٹی کامتا پرشاد صاحب بجرم رشوت ایک سال کے لئے معطل ہوگئے تھے اور ان پر مقدمہ چل رہا تھا اور اُدھر میم صاحب ان دنوں کچھ افسردہ خاطر و متوحش رہتی ہی تھیں کہ ذرا سی ان بن اور شکر رنجی کا موقع ہاتھ آیا۔ وہ حسب معمول مسٹر فاکس کے ساتھ اس دفعہ بھی رہنے لگیں مگر ڈپٹی صاحب نے حسب معمول نہ اُنکی زیارت ہی کی اور نہ خوشامد ہی۔ کہ وہ پھر آکر کوٹھی کو اپنے نور سے روشن کرتیں۔ شاید میم صاحب کو یہ گوارا نہ ہوا اسلئے دوسرے کا شگون بد کرنے کے لئے اپنی ناک کٹوا ڈالی یعنی حضرت عیسٰی کا سایہ قبول فرمایا۔ ڈپٹی صاحب مجبوراً اپنی زندگی کے لئے اسکو مردہ سمجھ بیٹھے۔ مسٹر فاکس نے شاید چال بازی و روبہ بازی سے کام نہ لیا ہو مگر انگلینڈ جاتے وقت ان کو یہیں چھوڑ دیا۔ اب نہ شان کے لئے پیسہ ہی پاس تھا اور نہ غصہ و دشنام کے لئے آدمی ہی چنانچہ پادری صاحب نے ترس کھاکر ان کو ان صاحب بہادر کے حوالہ کر دیا تھا۔ قصہ کو ختم کرتے ہوئے اس نے کہا "بھائی ہم روز روز نیا جوتہ کہاں سے لائے۔ اسی کو پہنا ہوگا۔ ذرا جلدی کرو"

عورت نے حیرت انگیزی سے کام لیا۔ فوراً جوتہ کو بھی گانٹھ کر اسکے اوپر پالش کی اور خود لیکر اسکے ساتھ چل کھڑی ہوئی جس مکان میں وہ داخل ہوئی وہ تنگ و تاریک گلی میں واقع تھا اور بظاہر کسی تانگہ والے کا معلوم ہوتا تھا کیونکہ اس چھوٹے سے مکان کے آگے ہی کے حصہ میں ایک گھوڑا بندھا ہوا تھا اور اور ایک خاص قسم کی سادگی و ادا کے ساتھ خشک گھاس کا ناشتہ کر رہا تھا جو عورت سامنے ایک بوسیدہ اور پارینہ کرسی پر بیٹھی ہوئی کشیدہ کاڑھ رہی اُسکی صورت سے وہ آشنا معلوم ہوتی تھی۔ اُس نے داخل ہوتے ہی سامنے جوتہ رکھکر قدم پکڑے اور ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے کہا "سرکار! ہم سے یہ دیکھا نہیں جاتا (جاتا) میم صاحب نے سر اُٹھاکر دیکھا۔ پہچان لیا اور برافروختہ ہوکر کہا "اوہ یہ وہی "شوخ چمارن" ہے۔ طعن کرتی ہے؟ اسکو یہاں کیوں لائے؟" صاحب نے جواب دیا "اوہ بڑی مالدار ہے۔ اسکو کون روکنے سکتا۔ خود چلا آیا" شوخ چمارن نے کہا "سرکار ناخوش نہ ہوئیں۔ میں تابعدار ہوں۔ سب آپ ہی کا ہے۔ جو حکم ہو....." میم صاحب نے قطع کلام کرتے ہوئے ڈانٹ کر کہا "خاموش ہو چڑیل! بناتی ہے؟ ایسی ٹھوکر ماروں گی کہ دانت ٹوٹ جائینگے" صاحب سے رہا نہ گیا بولا "آخاہ! رسی جل گئی مگر بل نہ گیا" وہ عورت وہاں سے سر نیچا کئے ہوئے جلدی آنکھ سے آنسوؤں کی گرم گرم ٹپک پڑیں۔ ایک سرد آہ کے ساتھ اسکے منہ سے نکلا "ہا کرشن۔ پیارے کرشن"

خاص

سنگم

[بابو ہریش چندر صاحب سریواستو ضیا بی اے دیوانند پوری]

رات پھاگن کی ہے کیا چھٹکی ہوئی ہے چاندنی ۔ چلتی ہے پچھوا ہوا چھٹکی ہوئی ہے چاندنی
آفریں صد مرحبا چھٹکی ہوئی ہے چاندنی ۔ شاد ہے چھوٹا بڑا چھٹکی ہوئی ہے چاندنی
دیکھنے والے نگاہِ غور سے اب کام لیں
منظرِ دل چسپ پر دل اپنا اپنا تھام لیں

یہ تسلی بخش عالم یہ خموشی کی بہار ۔ یہ برن بتیس اور اس پر غضب سولہ سنگار
کروٹیں لے لے کے چونکے عابدِ شب زندہ دار ۔ ایک اک ذرے سے رازِ حسنِ قدرت آشکار
اس گھڑی جو رازِ حق کی وجہ سے بیدار ہے
ہے اُسی کی ہوشیاری بس وہی ہشیار ہے

سیر ہو ایسے میں چلئے چل کے سنگم دیکھئے ۔ جو نہ دیکھا ہو کبھی عالم وہ عالم دیکھئے
ملتے ہیں گنگ و جمن کس دل سے باہم دیکھئے ۔ کہہ رہا ہے دیکھنے کا شوق ہردم دیکھئے
فیض پاتے ہیں عقیدت مند آکر سیکڑوں
ایک دو کیا ہیں جھکاتے ہیں یہاں سر سیکڑوں

اور بھی ان سے کئی چشمے ملے دریا ملے ۔ چند اس جانب سے جا کر چند اُدھر سے جا ملے
اس طرح بڑھ کر ملے جیسے کوئی بچھڑا ملے ۔ لطف ملنے کا یہی ہے لطف ملنے کا ملے
دیکھ کر امواج سے ساحل یہ سب کو جوش میں
دامنِ مادر کی صورت لے لیا آغوش میں

ہستیاں پہلے جو قطرہ تھیں وہ دریا ہوگئیں ۔ اس تماشہ گاہ میں طرفہ تماشا ہوگئیں
کچھ نہیں احساس باقی ملکر ایسا ہوگئیں ۔ دیکھئے تو کیا بنیں پھر کیا رہیں کیا ہوگئیں

فیض و عظمت سے ملا اچھا یہ عظمت کا مقام
دیتے ہیں چھوٹوں کو عالی ظرف عزت کا مقام
درس عبرت اُن سے لو سب بھول جاؤ اپنے فرق — اختلاف باہمی جتنے ہیں ان کو کر دو غرق
اس طرح چمکو زمین پر آسماں پر جیسے برق — ہو منور روشنیِ علم سے سب غرب و شرق
دُور ہو ظلمت ضیا ہو جائے پھر جھنڈا بلند
سربلندوں کے بھی آگے سر رہے اپنا بلند

خاص

اپنی اپنی سمجھ

بنگالی کو لوگ ناحق بدنام کرتے ہیں۔ وہ بیچارہ بہت ہی سیدھا ہوتا ہے۔ میں خود جانتا ہوں کہ ایک بنگالی بابو روز اپنے دفتر جاتے ہیں اور سب کے سب انھیں رت کہتے ہیں مگر وہ کچھ بُرا نہیں مانتے۔

مولانا سب کا ناک میں دم کئے ہیں کسی کو بولنے یا لکھنے نہیں دیتے۔ مگر کوئی انکے جی سے تو پوچھے کہ انکو کاہے کی فکر ہے۔ وہ بیچارے خود پریشان ہیں کہ جسکو دیکھو وہی ان سے مدعی ہے خوش قسمتی یہی ہے کہ انکو کورٹ فیس سے چھٹی مل جاتی ہے۔

بابا رام سمرن بڑے ہوشیار ہیں وہ کہتے ہیں کہ جہاں کوئی جائے وہاں کی جو مشہور چیز ہو خرید لے کہ یاد رہے کہ فلاں چیز آئی ہے۔ مگر ہندو ماما کی یہ رائے ہے کہ جہاں کی جو چیز ہو اسکو بنانا سیکھ لے کہ گٹھر لادنا بھی نہ پڑے اور غیر کی محتاجی بھی نہ رہے۔

ہملٹ کا کھیل ایک مشہور کمپنی کھیل رہی تھی جس وقت کہ ہملٹ اپنی پریشانی پر غور کر رہا تھا اور تمام تھیٹر ہال میں ایک سناٹا تھا ایک صاحب اطمینان سے اُٹھے اور کرسی پر کھڑے ہوکر بڑے زور سے چلائے "چلا جوتا" "چلا جوتا" پھر اپنی جگہ پر چپکے سے بیٹھ رہے۔ لوگ گھبرا گئے پولیس دوڑی مگر جب یہ معلوم ہوا کہ کچھ بھی بات نہ تھی تو جن صاحب نے شور کیا تھا اُنھوں نے فرمایا کہ غضب کا سناٹا تھا اگر میں یہ ترکیب نہ کرتا تو شاید تماشائیوں کے دل کی حرکت موقوف ہو جاتی۔

لارڈ اروِن کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ اُنکا قد بہت لمبا ہے۔ اب سب سرکاری آدمی خوش ہیں بڑی لمبی لمبی تقریریں سننے کو ملیں گی۔ مگر سوال تو یہ ہے کہ کبھی ان باتوں کی ہمارے یہاں کمی تھی؟ اور پھر لکھنؤ میں!

خریدار۔ ہمیں تھوڑی سی افیون خریدنا ہے۔

دوکاندار۔ میرے ہاں افیون تو نہیں ہے مگر تمنچا۔ رسی اور چھری ہیں۔

گذشتہ سے پیوستہ

لتھوری لال

(منشی جی۔ پی۔ سریواستو۔ بی۔ اے ایل ایل۔ بی)

رات ایک گھنٹہ گذر گئی۔ چاندنی آسمان پر خوب اچھی طرح چھٹک آئی۔ اتنے میں بندوق کی سی آواز ہوئی" معلوم ہوا کہ پچھلا ٹائر پھٹ گیا۔ پھر بھی بائیسکل رکی نہیں "آیہ" کا ہاتھ اب مارنے میں کام نہیں دیتا تھا۔ گالی گلوج اور رونا چلانا بھی اب بند ہو گیا تھا۔ خدا جانے تھک جانے کی وجہ یا کسی اور وجہ سے۔ اس وقت ہم ایسی جگہ تھے، جہاں سڑک کے دونوں طرف جنگل تھا۔ یہاں پر یہ کمبخت بائیسکل پھس پھسا کر رک گئی۔ ویسے ہی "آیہ" صاحبہ چونک کر بولیں "ارے! ایسی ڈراونی جگہ پر کیوں روکا؟"

میں اپنی بدحواسی میں چور تھا، اسکی بات کا بھلا کیا جواب دیتا۔ اسلئے بغیر کچھ کہے، اتر کر جیب سے دیاسلائی نکالی۔ اور جلاکر "اسپیڈو میٹر" میں دیکھا تو پتہ چلا کہ اس وقت ہم مکان سے ۱۰ میل کے فاصلے پر ہیں۔ یہ جانتے ہی کلیجہ بیٹھ گیا۔ جلدی سے "پٹرول کین" کھول کر دیکھنے لگا کہ اگر کچھ "پٹرول" ہو تو کچھ دور لوٹنے کی امید ہو جائے مگر یہ نہ سوچا کہ اگر اس میں کچھ "پٹرول" ہوتا تو یہ رکتی ہی کاہے کو؟ اب کس طرح سے اتنا لمبا سفر طے کر کے شریمتی جی سے ملوں؟ ہائے! یہ خیال آتے ہی میں ادھموا سا ہو کر سڑک پر بیٹھ گیا!

"آیہ" کچھ دیر تک معلوم نہیں کیا بڑبڑاتی رہی مگر جب اس نے دیکھا کہ یہ میری باتوں کا کچھ بھی جواب نہیں دیتا، تو وہ ذرا سے اچک کر میری بغل میں ہو رہی۔ میں بہت گھبرایا کہ کہیں یہ پھر نہ مارنا شروع کر دے، کیونکہ میرے سارے منصوبوں پر

یکایک پہاڑ ٹوٹ پڑنے سے اس وقت میں یوں ہی بے دم ہو رہا تھا۔ ایسی حالت میں اگر یہ پھر میری پیٹھ کی جھاڑ پونچھ کرنے لگی تو شرکیتی جی سے بعد میں بھی ملنے کی میری رہی سہی امید پر اب ایک دم الٹی جھاڑو پھر جائیگی۔ مگر واہ ری قسمت! مگر اس نے بڑی بھلمنساہت سے پوچھا "کیوں جی" بولتے کیوں نہیں؟"

میں۔ مارے ڈر کے۔

آیہ۔ واہ! تم تو بڑے جیوٹ کے آدمی معلوم ہوتے ہو۔ تمہیں بھلا ڈر کس بات کا؟

میں۔ جیوٹ کا آدمی؟

آیہ۔ بیشک! تمہارے سوائے کہیں اور بھی کسی کی ایسی ہمت ہو سکتی تھی، جو مجھے اپنے ساتھ بھگا لاتا؟ ضرور تم مجھ پر پہلے ہی سے عاشق رہے ہوگے، تبھی تو ایسی دلیری کی!

میں۔ نہیں نہیں۔ تم غلطی کرتی ہو۔ میں نے تمہیں آج سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا اور نہ میں جان بوجھ کر تمہیں اپنے ساتھ لایا ہوں میں قسم کھاکر کہتا ہوں، میں نے کسی قسم کی دلیری نہیں کی ہے۔ ہاں! مار کھانے میں مجھ سے دلیری البتہ ہوگئی ہے۔ وہ بھی مجبوراً" اور کسی بات میں نہیں۔

آیہ۔ اخاہ! قربان جاؤں اس بھولے پن پر! ذرا آنکھیں تو ملائیے!!

ہائے! غضب ہوگیا۔ وہ کمبخت یہ کہکر اور بھی نزدیک آگئی اور میری ٹھوڑی پکڑ کر میرا منہ اپنی طرف گھمانے لگی۔ میں پسینے پسینے ہوگیا۔ زبان تالو سے جالگی اور حلق خشک ہوگیا۔ جتنی گھبراہٹ مجھے مار کھاتے میں نہیں معلوم ہوئی تھی، اس سے کہیں زیادہ مجھے اسکی چھیڑ چھاڑ سے ہونے لگی۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ چھپا لیا اور چلّا اٹھا "پانی! پانی!!"

آیہ۔ پانی اس جنگل میں کہاں مل سکتا ہے! اچھا ٹھہرو۔ میرے جیب میں بچوں کے لئے کچھ بسکٹ اور دودھ پلانے والی شیشی تھی دیکھوں ہے یا نہیں..... ہے! ہے!! یہ ہے!!! لو اسے ذرا پی لو۔"

یہ کہکر اس نے اپنے جیب سے بچوں کے دودھ پلانے والی شیشی نکالی اور اس کی ربڑ کی چُچھی میرے منہ میں ٹھونسنے لگی۔ اب تو مجھ سے نہیں رہا گیا۔ یہ کمبخت بچوں کی دایہ یا آیہ یا ماں بھلے ہی ہو سکتی تھی، مگر مجھ ایسے ڈھیلے ڈھالے مونچھیالے، سوا پانچ فٹ کے آدمی کو اسکا اپنی گود کا دودھ پیتا بچہ بنانا آپ ہی سوچئے کتنی بڑی بات تھی۔ میں نے جھٹ سے اسکا ہاتھ پکڑا اور جھنجھلا کر اپنے منہ کو ہٹا لیا۔ مگر پھر بھی میں کچھ بول نہ سکا۔ معلوم نہیں کیوں میں اس سے اتنا ڈر رہا تھا۔ میری ایسی حالت تو سنا تھا اکثر عورتوں ہی کی ہوتی ہے جب وہ اکیلے کسی بدمعاش کے پالے پڑجاتی ہیں جس سے وہ نفرت کی وجہ سے جان چھڑا کر بھاگنا چاہتی ہیں۔ مگر کسی مرد کو بدمعاش سے بدمعاش عورت کے سامنے بھی اتنا گھبراتے اور بدحواس ہوتے نہ

کبھی دیکھا نہ سُنا تھا، اور نہ کہیں پڑھا ہی تھا۔ اسلئے میں نے اسی وقت سمجھ لیا کہ خدا نے مجھے مرد کا چولا دینے میں البتہ کوئی بھول نہیں کی ہے، پھر بھی وہ مجھے اصلیت میں مرد بنا نہیں سکے۔ اس بات میں ضرور وہ کہیں نہ کہیں غلطی کر گئے ہیں، ورنہ دنیا میں کون ایسا الّو مرد ہوگا کہ جسکی کسی عورت کے سامنے ایسی نانی مر جائے کہ اُسے گھنٹوں مار کھانے پر بھی کچھ نہ بولے اور اسکی چھیڑ پر دم دبا کر بھاگے۔ مگر بھائی! میں کرتا تو کیا کرتا؟ وہ عورت ہی ایسی تھی۔ مارتے وقت بالکل "آگیا بیتال" تھی تو اس وقت ایسی "سمندر سوکھ" ہو رہی تھی کہ بڑے بڑے ہمالیہ پہاڑوں کا کلیجہ اُس آندھی پانی میں کانپ جاتا، تو میں بھلا کس کھیت کی مولی تھا؟

وہ مجھے اپنا ہاتھ پکڑتے دیکھکر اور بھی نزدیک کھسک آئی اور بڑے تپاک سے بولی "اچھا دودھ نہ پیو، ایک پان کھالو۔ تمہاری پیاس بجھ جائیگی۔ ارے! میری ڈبیہ میں تو کل ایک ہی پان ہے! کوئی ہرج نہیں! آدھا میں کھائے لیتی ہوں اور اور آدھا تم کھاؤ!

اس نے سچ مچ ڈبیہ سے پان نکال کر آدھا خود کتر لیا اور باقی کترے ہوئے حصہ کو میرے منہ کی طرف بڑھایا۔ میں مارے غصہ کے جل مرا۔ مگر غصہ آیا بھی تو کس پر؟ خدا پر۔ جن کی منتیں اپنی شریمتی جی سے ملنے کے لئے مانتے مانتے میں مرمٹا اور اُنھوں نے میری عرض سُنا ضرور، مگر ملانے میں پھر بھول کر گئے۔ انھیں ملانا چاہئے تھا مجھے میری محبوبہ سے، مگر انھوں نے مٹھ بھیڑ کرا دیا مجھے اس چڑیل سے۔ اسی لئے جس جلاہے کا کھیت اسکے پڑوسی کی بکری روز چر جایا کرتی تھی اور اُس بیچارے نے تنگ آکر تمام رات دعا مانگی کہ اللہ میاں بکری مر جائے، مگر صبح کو دیکھا کہ خود اسی کا بیل مر گیا تب اُس نے ٹھیک ہی کہا تھا "اللہ میاں تمہیں اتنے دنوں اللہ میائیں کرتے ہوگیا، مگر اب تک تمہیں بکری اور بیل کی تمیز نہ ہوئی" اور اب مجھے بھی کہنا پڑتا ہے کہ "ایشور تم صرف جانور ہی نہیں پہچان پاتے ہو بلکہ عورت عورت میں فرق نہیں جانتے ہو۔ کیا کہوں، نہ ہوا سوراج ورنہ تم ایسے اناڑیوں کو ایشور گیری ہرگز نہ کرنے دیتا تمہارے خلاف میں ضرور کوئی نیا کینڈیڈیٹ کھڑا کرکے سارے ملک کے 'ووٹ' دلوا دیتا۔ مگر آج کل تو تمہارا راج ہے، جو چاہو دھاندلی کرو۔ جانتے ہو نہ کہ تمہارے سامنے کسی کی کچھ چل نہیں سکتی!؟

ہائے جو کہیں تم میری پیاری سے مجھے ملا دیتے تو اسکا جھوٹن، اسکے تلوے کا دھوون بھی ایک سانس میں غٹ سے پی جاتا۔ مگر میں مرگھنڈی دیوی کا جھوٹن کس طرح چالوں؟ تا با با! یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ یہ خیال آتے ہی آنتیں الٹی پڑتی ہیں"

اسلئے میں نے جلدی سے اپنا سر جھکا کر اپنا منہ دونوں ہتھیلیوں میں چھپا لیا، اور ہاتھ جوڑ کر بولا "مجھے معاف کرو"

اب کیا تھا۔ اس نے مجھے ہاتھ جوڑتے دیکھ کر

جھٹ اپنا ہاتھ میری گردن میں بغیر نوٹس" دے
ڈال دیا۔ میری جان سوکھ گئی۔ ایسا معلوم ہوا
کہ میرے گلے میں پھانسی کا پھندا پڑ گیا۔ وہ مجھے
اپنی طرف کھینچتی ہوئی بولی

"ارے! واری جاؤں ان نخروں پر! کیا کہنا
ہے! تم نے تو گوئے کی دولہن کے بھی کان کاٹے۔
ارے میاں ذرا سر تو اٹھاؤ۔ کچھ باتیں کرو۔ مرد بھی
کہیں اتنا جھینپتے ہیں؟"

میں نے لڑکھڑا کر جواب دیا "مگر.... مگر...
میں.... میں شاید مرد نہیں ہوں!"

وہ چونک پڑی، تعجب میں آکر اُس نے پوچھا۔
"تو کیا مرد کی پوشاک میں تم کوئی عورت ہو؟"
میں "نہیں، یہ بات بھی نہیں ہے۔"

وہ "جب تم نہ مرد ہو اور نہ عورت ہی ہو تب
تم ہو کیا چیز؟ تم پیدا ہوتے ہی کیوں نہ مر گئے۔"

یہ کہہ کر وہ تن کر کھڑی ہو گئی اور ایک دم ورلئے[1]
روپ دھارن کر لیا"۔ میرا دل دہل گیا"۔ تھوڑی دیر
تک وہ مجھے شیرنی کی طرح گھورتی رہی۔ اسکے بعد وہ
یکایک اُبل پڑی اور کھلکھلا کر اس نے دو لاتیں میری
پیٹھ پر جمائیں اور بولی "ایسے آدمی کو چولہے میں جھونک دوں!"
میں نے روانسا ہو کر جواب دیا "ابھی نہیں شریمتی جی
سے مجھے مل لینے دو اتب"[2] کاپی رائٹ (باقی آئندہ)

۱؎ بہت بڑا اور بھیانک

۲؎ آب دیدہ

رسالہ بازی

[جناب منشی جگت موہن لال صاحب بشنا گر بی۔اے]

نام تھا اسکا "مہر منور" لیکن تھا کیا یہ پڑھنے والے۔
جانچنے والے اور دیکھنے والے ہی کہہ سکتے ہیں لکھائی
چھپائی بڑھیا۔ مضامین حسب و برجستہ۔ تصاویر دلآویز
اور دل خوش کن۔ کچھ مشہور عمارتوں کی کچھ قدرتی
مناظر کی کچھ شعراء مصنفین کی اور کچھ ذرا تامل سے
دل تھام کر سنئے۔ لاس انجیس کے ہولی وُڈ کے درخشندہ
ستاروں (سٹاروں) یعنی چمن حسن کی بلبلوں مشہور
زمانہ ایکٹریسوں کی۔ مضامین تھے کچھ مذہبی۔ سیاسی
ادبی۔ مجلسی۔ معاشرتی۔ غرض بیچ میل اچار یا چوں
چوں کا مربہ۔ جملہ چاشنیوں کا مرقع تھا۔ قیمت تھی
عوام سے ایک کاپی آٹھ آنے، سالانہ چار روپے۔ والیان
ریاست سے چھ روپے نقد سکہ چہرہ شاہی۔

پہلے نمبر کے شایع ہونے سے کچھ عرصہ پہلے ہی ۲۰×۳۰
کے بڑے کاغذ پر اشتہار چھپوا کر بازاروں اور کوچوں کے
ان ناکوں پر جہاں دیوار پشت تھا پشت کی اشتہار بازی
کی بدولت گلزار ارم بنی ہوئی تھی چسپاں کرا دئے گئے
تھے۔ جلی قلم اور خط گلزار میں تحریر تھا "مہر منور" سبحان اللہ
کیا پیارا نام تھا۔ بہت سے اشتہار پڑھنے والوں کو تو
یہی گمان ہوتا تھا کہ یہ بس اب تاریکی کا دور دورہ ختم
ہوا۔ مہر منور اپنی چمکیلی کرنوں سے جہان پر ضیا
پاشیاں کریگا۔

سرتاج ادارہ تھے۔ میر برکت علی صاحب۔ آپ

کہنہ مشق مضمون نگار اور پُرانے ادیب تھے۔ شاعر نہ تھے۔ لیکن شاعری سے مس ضرور تھا۔ غزل۔ ہزل۔ رباعی مثنوی۔ مخمس۔ مسدس کو خوب سمجھتے تھے۔ عروض و قوافی اور رموز شاعری سے بے بہرہ نہ تھے چنانچہ جب کبھی مشاعرے میں رونق افروز ہوتے تھے تو واہ واہ مرحبا۔ مکرر فرمائیے کے نعروں سے بزم ادب کی رونق دوبالا کیا چوبالا ہو جاتی تھی۔ لیکن خیر سے تھے بڑے پکے رسالہ باز۔ شاید ناظرین۔ اس نئی اختراع پر بے حد خندہ زن ہونگے یا کم ازکم زیر لب تو ضرور مسکرا ئینگے۔ لیکن جہاں زمانہ سلف سے کبوتر بازی بٹیر بازی۔ پتنگ بازی تیتر اور بہت سی بازیاں اپنا گل کھلاتی ہوئی چلی آرہی تھیں۔ وہاں اس بیسویں صدی میں یہ نئی بازی اور ایجاد ہوئی ہے۔ ہر چوہا جسے ایک ہلدی کی گانٹھ مل جاتی ہے۔ پنساری ہونے کا دم بھرتا ہے۔ چنانچہ میر صاحب بھی ازل سے کچھ ادبی شوق لیکر پیدا ہوئے تھے۔ انھوں نے یہی بازی شروع کردی یعنی کچھ دن کے لئے ایک موٹی مرغی پھانسی۔ لمبے چوڑے اشتہار دیئے اور جھٹ ایک رسالہ شائع کر دیا۔ لیکن خدا ان مرحوم رسالوں کو جنت نصیب کرے۔ بس دو تین پرچے نکلنے کے بعد ایسا سناٹا چھاتا تھا۔ کہ خریدار بیچارے پیچ و تاب کھا کر ہی رہ جاتے تھے۔ اسی طرح پر میر صاحب کو پانچ مرحوم رسالوں کا ایڈیٹر رہنے کا فخر حاصل ہو چکا تھا۔ اب مہر منور کے نام پر چھٹی مرتبہ چھری پھیری جا رہی تھی۔ لیکن اب کی مرتبہ ایک ایڈیٹوریل بورڈ بنا تھا جسکے صدر آپ ہی تھے۔

اس امر سے تو کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ شاعر اور ادیب قدرتاً عاشق مزاج ہوتے ہیں۔ چنانچہ میر صاحب بھی اس نعمت عظمےٰ سے محروم نہ تھے۔ روپیہ پیسہ آپ کے سامنے کچھ حقیقت نہ رکھتا تھا۔ اور آپ بیدریغ لٹاتے تھے۔ لیکن آپ کے پاس نقد دل ہی ایک ایسی چیز تھی جسکو علیحدہ کرنے میں آپ کو کافی تامل ہوتا تھا۔ شادی ہونے کے وقت اِسے عروس نو کے حوالے کرکے آپ سبکدوش ہو گئے تھے۔ اب آپ کے پاس وہ چیز ہی نہ تھی جسے چور چُرالے یا لٹیرے لوٹتے۔ لیکن جب سے آپ نے کرسی ادارت سنبھالی تھی تب سے آپ کو پھر اُسی ٹکسالی سکے یعنی دل کی ضرورت محسوس ہوئی۔ دلہن سے نہ جانے کتنی منتیں سماجتیں کیں۔ انکے صدقے گئے۔ انکی ٹھوڑی کو ہاتھ لگاکر ذرا عاجزی سے کہا۔ "سرکار تھوڑے دن کے لئے دیدو۔ جلد واپس کردونگا" بیوی بھانپ گئیں۔ آخر تو ان کی عادتوں سے واقف ہوگئی تھیں۔ پہلے ٹالا۔ کچھ ہنسیں۔ کچھ مسکرائیں۔ کچھ روٹھ کر منہ پھیر لیا۔ آخر رحم کھاکر دل جیسی بیش بہا چیز کو کچھ عرصے کے لئے عاریتاً دیدی۔ میر صاحب کچھ زیادہ معمر نہ تھے۔ البتہ اپنی زندگی کی انیس بہاریں دیکھ چکے تھے۔ صوم و صلواۃ کے گو اتنے پابند نہ تھے۔ لیکن مذہبی دنیا میں آپ مشہور خوب تھے۔ کچھ مذہبی کتابوں سے تواریخوں سے۔ متراجم سے آپ اپنے رسالے کے شروع کے صفحات ضرور مزین کرتے تھے۔ لیکن اِسی مذہبی لائسنس کی آڑ میں بقیہ رسالے

کی من مانی خصمت دری کرتے تھے۔ جہاں عرب والے پیا کی یاد آپ کو تڑپاتی تھی وہاں بمبئی والی۔۔۔۔کی یاد۔ دل میں چٹکیاں لیتی تھی۔ جہاں آپ کی دلی مینا بیوں کا تذکرہ ہوتا تھا۔ وہاں جذبات میں ایک ترنم سا پیدا ہو جاتا تھا اور بخدا خیالی معشوق کے فراق میں جان تک دے دینے کو جی چاہتا تھا۔ آہ آپ اُسکا کب دلاویز چربہ اُتارتے تھے کہ بس ہاتھ قلم کر لینے کو جی چاہتا تھا۔ بھولی بھالی صورت۔ معصوم چہرہ۔ سادگی کی تعریف میں آپ کہتے تھے۔

اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

ساری کے آنچل میں نجانے کتنے جذبات چھپے تھے اسکے ہٹ جانے سے نجانے کتنی آرزوئیں پوری ہونے کا گمان تھا۔ بہرحال اس معصوم صورت کو دیکھ کر بیساختہ کا شانہ دل میں بٹھا لینے کو جی چاہتا تھا۔ لکھنؤ سے بمبئی کچھ کم فاصلہ نہیں ہے لیکن مریض عشق توبہ توبہ مجنون عشق کی جسمانی رفتار خیالی پرواز سے کہیں تیز ہوتی ہے کئی بار بمبئی گئے۔ وہاں سے روپیہ بھی لائے اور حسینان جہاں کی تصاویر بھی لائے لیکن نقد دل جو بیوی سے عاریتاً لے گئے تھے۔ وہ وہیں ایک دوشیزہ کے پاؤں تلے روندے جانے کے لئے چھوڑ آئے۔ اس نے کئی بار ٹھکرایا۔ باہر پھینکوایا۔ لیکن رنجور غم کو چین کیسے آتا۔ پاندان کے پاس پٹک دیا۔ چلو اچھا ہوا۔ آتے جاتے ان کے جوتا آلودہ پیروں سے روندا جائے گا۔ لیکن بیوی کے لئے کیا لے کر آئے ہاتھے فیشن کی سوغات۔ آپ نے بلبلان فرنگ کو پھدکتے اور چہکتے ہوئے دیکھ لیا۔ انکی تراشیدہ زلف پریشان چلتے پھرتے میں کچھ عجب انداز سے حرکت کرتی تھی۔ پس طبیعت کو بھا گئی۔ آتے ہی قینچی لی اور دلہن کی لمبی لٹکتی ہوئی چٹیا پر چلا دی۔ شنگلنگ اور بٹنگلنگ کا تجربہ کر ڈالا۔ وہ کہتی رہ گئیں ظالم میری چٹیا۔ میری چٹیا۔ ٹھیک کر لولیں۔ ہائیں تمہاری کچھ عقل جاتی رہی ہے۔ بڑے آئے ہیں وہ فیشن کے دلدادہ بنکے۔ ناحق میرے بالوں کو تراش دیا۔ ہئے ہئے تمہیں ذرا رحم نہ آیا۔ میں شرم کے مارے مری جارہی ہوں تمہاری کٹھولی ہوئی۔ واہ صاحب واہ میری اتی دیکھینگی تو کیا کہینگی۔ کہاں کا فیشن نکالا ہے یہ گھوڑی بال کٹی جس میں ہیجڑا سی مجھے تو ذرا نہیں سہاتیں۔ ہاں کاٹنا اتنی ہوتی سوتیوں کے۔ میر صاحب کرنے کو کر گذرے لیکن ان کے عتاب کی تاب نہ لا سکے۔ خجالت سے سر جھکائے ہوئے اپنی نشست میں تشریف لے آئے۔

رسالے کی اگلی سرخی تھی "وصال کے مزے" بس اسی مضمون کو تو جو بھی پڑھتا تھا چٹخارے لے لیکر نوجوان تو نوجوان۔ بوڑھے اور نامردوں کو بھی قوت باہ اور طلائے رفیق حیات کی ضرورت نہ رہتی تھی۔ اچھے اچھے پارساؤں کا وضو ٹوٹنے کا ڈر ہوتا تھا۔ میر صاحب اس بات کے قایل تھے کہ چٹنی میں کھٹا میٹھا چرپرا سب ہی ذائقے ہوتے چاہیں۔ اس شیرینی سے جو لطف اندوز ہوتا تھا وہ بحر کیف میں غوطے کھانے

لگتا تھا۔ننھی ننھی بوندیاں۔ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے۔موسم پر شگال کا جب خیال آتا تو طبیعت مچل اٹھتی ہے رسالہ "مہر منور" بالفاظ دگر جام جہاں نما تھا۔

ڈاکخانے میں رسالے کا پتہ درج تھا حضرت گنج لکھنؤ۔لیکن اِس سرے سے اس سرے تک ڈھونڈ جاؤ۔کوئی پتہ بتانے والا نہ تھا۔یہ تو رہی شہر کے باشندوں کی بات اور اگر کوئی اجنبی جا پھنسے تو بس خدا ہی حافظ۔جب حضرت گنج میں دو چار دوکانداروں سے پوچھا۔"میاں "مہر منور" کا دفتر کہاں ہے؟"

"مہر منور"؟... یہ کیا بلا ہے جناب؟"

ارے میاں وہی اُردو کا رسالہ جو ابھی نکلنا شروع ہوا ہے اور جس کے چیف ایڈیٹر میر برکت علی صاحب ہیں" برکت علی ورکت علی ہم کسو کو نہیں جانتے۔البتہ احمد بخش نے ایک اخبار نکلا ہے۔ وہ لالٹین کے سامنے والی گلی میں چلے جاؤ۔"

"وہ نل کے پاس والی لالٹین؟"

نہیں میاں وس سے اگلی والی"

گلی میں گھسے۔گلی تھی تو پختہ۔لیکن مہترانی کے لبریز ٹوکروں کے تعفن سے تمام فضا پُر ہوگئی تھی۔دماغ پریشان ہوتا تھا اور کلیجہ منہ کو آتا تھا۔خیر چیراً و قہراً وہاں جانا ہی پڑا۔"مہر منور" کی تلاش تھی اور "کمال کے مزے" سے لطف اندوز ہوتا تھا۔ دماغ عجیب خیالات سے پراگندہ تھا۔خیال ہوتا تھا کہ یہ اخبار والے اپنی نوعیت کے لحاظ سے عجیب ذہنیت کے مالک ہوتے ہیں۔کوئی کتاب یا رسالہ جب ریویو کے لئے اُنکے پاس پہنچتا ہے تو جھنجلا اُٹھتے ہیں۔ ارادہ کرتے ہیں کہ اسکا ریویو نہ کرینگے۔ لیکن کسی خیال کو مدنظر رکھکر اس کتاب یا رسالے کے مختصر اقتباسات درج کرکے اسکا خاک اُڑانا چاہتے ہیں۔لیکن اس وقت وہ فطرت انسانی کو بالکل بھول جاتے ہیں یعنی جس کام کو کرنے کے لئے روکا جائے انسان اُسے ضرور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔یہی حال یہاں ہوا یعنی اُس عنوان کی چند سطور بطور عیب جوئی کے لکھنے سے بھی نئے رسالے میں لوگوں کو کتنی دلچسپی پیدا ہوگئی۔ ورنہ اس طرح گلی گلی کوچہ کوچہ در در ٹھوکریں کھاتے۔خیر ذرا آگے بڑھے۔ نہ کوئی سائن بورڈ نہ پتہ نہ نشان۔ایک شریف آدمی سے پھر دریافت کیا۔"کیوں حضرت یہاں "مہر منور" رسالے کا دفتر کس جگہ ہے۔

آپ نے کچھ مسکراکر انگلی کا اشارہ کرکے فرمایا۔ وہ سامنے کے پھاٹک میں ہے جناب"

یہاں تو کوئی بورڈ ورڈ ہے نہیں۔

اجی جناب ہاتھی کے دانت کھانے کے اور ہوتے ہیں دکھانے کے اور۔ یہ تو اخبارات ورسائل کے لئے ہی دھوکے کی ٹٹی ہے جو اتنی لمبی چوڑی سرخیوں سے اشتہار شائع ہوتے ہیں۔ ورنہ بس خدا ہی حافظ ہے۔آپ یہاں کہاں آن پھنسے۔

بابو صاحب کا یہ فقرہ سنکر جی جلکر کلابتو ہی تو ہوگیا۔دل میں سوال پیدا ہوا کیوں کیا محنت یونہی رائیگاں جائیگی۔طبیعت ذرا مضمحل دیکھکر بابو صاحب نے فرمایا۔"نہیں نہیں میرا مدعا آپ کو مایوس کرنے کا

نہیں تھا۔ آپ کا پی ہی چاہتے ہیں نہ وہ آپ کو ملجائیگی۔"

جی ہاں۔ جی ہاں بس یہی چاہتے ہیں۔ آداب شکریہ۔"

پھاٹک میں داخل ہوتے ہی خیال ہوا۔ عجیب لوگ ہیں۔ برعکس نام نہند زنگی کا فور۔ یہ "مہر منور" کا دفتر ہے۔ توبہ توبہ یہ تو شب دیجور سے بھی تاریک ہے۔ لمبی اندھیری دہلیز جس میں خدا جھوٹ نہ بلوائے تو تین تین انچ موٹی گرد جمی ہوئی۔ اگر ایک معمولی سی ٹھوکر لگ جائے تو آگے کا مطلع تیرہ وتار ہوجائے صحن میں داخل ہوئے تو عجب نقشہ۔ اِدھر اُدھر کے دالانوں میں دھوبیوں کے بیل بندھے ہوئے۔ کہیں گوبر۔ کہیں شاشہ۔ کچھ میلے پانی سے بھری ہوئی ناندیں۔ ایک طرف بھٹی اور کونے میں راکھ کا ڈھیر مٹی کے ٹھنے کچھ تسلے۔ ایک جگہ میلے کپڑوں کا انبار۔ دو چار بچے خاک دھول میں کھیل رہے ہیں۔ ایک دالان کچھ ذرا صاف معلوم ہوتا تھا۔ اس میں ایک مٹی کے تیل کا چراغ رکھا ہوا تھا۔ ایک چٹائی مٹی کا بدھنا۔ پرانی وضع کا قلمدان۔ صحن میں کئی جگہ بے ڈول نالیاں بنی ہوئی تھیں جنکی وجہ سے کافی کیچڑ ہوگئی تھی اور قدم قدم پر پھسل کر گر پڑنے کا خوف لاحق ہوتا تھا۔ سامنے دیوار پر جلی حروف میں بورڈ لگا ہوا تھا۔ "مہر منور" چلو خدا خدا کرکے منزل مقصود تک تو پہنچے۔ جی میں جی آیا۔ ڈرتے جھجکتے آواز دی۔ اجی جناب میر صاحب دو تین آوازوں کے بعد ایک لڑکا ننگے سر ننگے پاؤں ایک میلا سا کرتا پہنے ہوئے ہاتھ ہلاتا ہوا باہر آیا۔ کہئے یہاں کیا چاہئے؟"

"ارے بھئی میر صاحب ہیں؟"

"کون میر صاحب؟ یہاں کوئی میر صاحب ویر صاحب نہیں رہتے؟"

"ارے بھائی لڑکے وہ رسالے کے اڈیٹر جن کا بورڈ اوپر لگا ہوا ہے۔"

وہ تو یہ غنیمت ہوا کہ ایک صاحب نے اُوپر سے سن لیا اور لڑکے سے کہا "اوپر بے آرشید" ورنہ بڑا ظلم ہوتا۔ اتنی محنت بھانگ کے بھاڑے میں جاتی۔ مکان کی ہیئت سے تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ شاید نواب غیاث الدین حیدر کے زمانے میں گھوسنوں کے لئے بنوایا گیا ہوگا۔ زینے کی سیڑھیاں ماشاءاللہ کچھ ایسی بے ڈھنگی تھیں کہ جسے اچھی طرح جمنا سٹک کرنی نہ آتی ہو وہ چڑھ بھی نہ سکتا تھا۔ ایک اونچی ایک نیچی۔ کسی کی لکڑی نکلی ہوئی۔ کسی کی اینٹ سرکی ہوئی۔ گرد کا یہ عالم کہ ذرا زور سے پاؤں پڑا اور وہ کوٹ کے گریبان تک پہنچی۔ دھماکہ ایسا ہوتا تھا کہ پاؤں اب دھنسا اب دھنسا۔ اس کے گوشوں میں مکڑیوں نے موزوں مقام سمجھکر اپنے جالے تن دئے تھے۔ کہیں کہیں طاق کے پاس چراغ کا کاجل منجمد ہوگیا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اِسے صاف کرنے کے لئے حلال خوری نے کبھی زحمت گوارا نہ کی تھی۔ اُچھلتے پھدکتے جب سب سے اوپر کی سیڑھی پر پہنچے۔ وہاں ایک بچہ اپنی رفع حاجات کر رہا تھا۔ خوب لور پھیلایا چھوٹی سی چھت طے کرنے کے بعد ایک کمرہ آتا تھا۔ یہی کتب خانہ۔ یہی دفتر یہی جائے رہائش تھی۔

وہاں ایک خوشنویس صاحب غالباً تھے رسالے کے لئے کاپی لکھ رہے تھے۔ انھوں نے بٹھایا۔ آنے کا سبب دریافت کیا۔ یہاں سوال تھا۔ "رسالے کی کاپی چاہئے" مالک اخبار یعنی سیر برکت علی صاحب کی پکار ہونے لگی۔ لیکن انھوں نے بیس منٹ تک کرم نہ کیا۔ اسی اثنا میں کئی نوآموز مضمون نگار آئے اور اپنے مضمون دے کر چلے گئے۔ تب خوشنویس صاحب نے پوچھا کیوں صاحب آپ قیمتاً لینا چاہتے ہیں یا بطور نمونہ ....."

قیمتاً۔"

اس میں انھیں کیا تامل ہو سکتا تھا۔ آٹھ آنے حوالے کئے اور رسالہ لے لیا۔ ازراہ ہمدردی انھوں نے پتہ طلب کیا۔ اور فرمایا کہ آئندہ ماہ کی کاپی بھی آپ کے پاس روانہ کی جائیگی۔ دل سے انکا شکریہ ادا کیا اور پھر انھیں دشوار گذار راستوں سے گذر کر باہر سڑک پر آگئے۔ اور "وصال کے مزے" لیتے ہوئے گھر پہنچے راستے بھر اس دلفریبی میں اتنے محو رہے کہ کئی جگہ تانگے اور سائیکل سے ٹکر ہوتے ہوتے رہ گئی۔ وصال تو ہو چکا اب انتظار تھا۔ کہ "مہر منور" تولید کا مژدہ کب سناتا ہے۔ لیکن آج تک اسکا پتہ نہیں۔ شاید بقول حضرت سعدی۔

قرص خورشید در سیاہی شد
یونس اندر دہان ماہی شد

بہرحال کچھ بھی ہو۔ سر دست تو اردو صحافت میں اضافہ ہی ہوا۔ آئندہ اگر "مہر منور" بھی سیر صاحب کی جیبی علت "رسالہ بازی" کی نظر ہوا تو اس میں کسی کا کیا قصور ہماری ہر روز سفارش ہے کہ سیر برکت علی صاحب سے صحیفہ نگاروں کو ضرور متعارف ہونا چاہئے اور نئے مدیروں کو تو ضرور ان کی آستاں بوسی کرنی چاہئے شاید کچھ ایسا نسخہ تجویز کر دیں۔ جس سے مرض رہے نہ مریض۔ لوگ امانت دل کی بابت پوچھتے ہیں۔ اس کا پتہ نہیں واللہ عالم کیا ہوا۔ اُن کی زوجہ نے اُن سے پھر تقاضہ کیا یا نہیں۔ اب کی مرتبہ ملاقات ہوگی تو ضرور دریافت کیا جائیگا۔

خاص

اپنی اپنی سمجھ

ایک لڑکی اپنے چھوٹے بھائی کو بیٹھی کھلا رہی تھی۔ اسکی ماں مکان کے اندر تھی۔ ایک مہمان صاحب تشریف لائے اور پوچھا اس بچی کی کیا عمر ہے؟ لڑکی آج کل کے فیشن سے واقف تھی جواب دیا۔ ابی صاحب یہ کسی سال کی نہیں ہے اسی سال کا نمونہ ہے؟

ایک مرتبہ شبلی تفریح کے لئے جا رہے تھے راہ میں لارڈ دوست ملے اور انھوں نے دریافت کیا، شبلی! تم بیوقوف ہو کہ نالائق؟ شبلی نے فوراً دونوں لارڈوں کا ہاتھ تھام اور قسم کھا کر کہا "حضور میں دونوں کے درمیان میں ہوں۔"

دیوی سروجنی نائیڈو

[حضرت شاطر الہ آبادی]

الفت کا راگ باہم مل جل کے گا رہے ہیں خوش آمدی کے جلسے کیا کیا دکھا رہے ہیں
عیش و خوشی کے نغمے سب کو سُنا رہے ہیں کچھ لوگ جا رہے ہیں کچھ لوگ آ رہے ہیں
مسرور و شاد بے حد آج اہل انجمن ہیں
دیوی سروجنی کی آمد میں سب مگن ہیں

عالم میں نام ان کا دُنیا میں نام ان کا ایک ایک جانتا ہے کیسا ہے کام ان کا
چرچا کہاں نہیں ہے اب صبح و شام ان کا سُنتے ہیں گوش دل سے سامع پیام ان کا
قربان کر رہی ہیں جان اپنی یوں ہُن پر
پروانہ جیسے صدقے ہو شمع انجمن پر

بھارت کا دم بھرا تھا بھارت کا دم بھرینگی کیا کیا نہیں کیا ہے کیا کیا نہیں کرینگی
سیوا میں دیش کی یہ کیونکر و ہیں ڈرینگی پیچھے نہ پاؤں اپنا اس راہ میں دھرینگی
سینچا ہے سینچتی ہیں ہر دم چمن کو اپنے
سیراب یہ کرینگی پیاسے وطن کو اپنے

روشن ضمیر ان کا روشن دماغ ان کا ہر گھر میں جل رہا ہے روشن چراغ ان کا
ہے ملک کی خوشی سے دل باغ باغ ان کا کیسا تھے وطن سے پڑ رہے ایاغ ان کا
بدست ہے زمانہ دل بھی قرار میں ہے
کوئی سرور میں ہے کوئی خمار میں ہے

اصلاح باہمی میں عمر اس قدر بسر کی زحمت میں دن گذارے محنت ہی میں گذر کی
یہ رائے ہے مناسب ہر فرد ہر بشر کی ساری انھیں کے دم سے رونق ہے اپنے گھر کی
عالی مزاج کہئے، روشن دماغ کہئے
بھارت کی انجمن کا ان کو چراغ کہئے۔

کیوں خوش نہ اپنا دل ہو جب وقت رنگ لائے　　ہر ایک شاد ہو کر نغمے ہمیں سنائے
دیوی سروجنی کے مدفن کے لطف اٹھائے　　شاعر کے لب پہ فقرے مدح و ثنا کے آئے

آفاق سے ہویدا ہے کایستھ پاٹھ شالہ *
دیکھے تو کوئی کیا ہے کایستھ پاٹھ شالہ

خاص

رنگِ تغزل

[افضل الشعراء بابو نارائن ورما مہر]

نکہتِ گل کی طرح ہم کو چمن یاد نہیں　　کیا غریب الوطنی ہے کہ وطن یاد نہیں
نہیں بھولا کہ تجھے بھول گیا عہد وفا　　یاد ہے یا تجھے اپنا وہ سخن یاد نہیں
پوچھ دل سے جو کچھ اور ہو گذری دل پر　　مجکو کچھ اور بجز رنج و محن یاد نہیں
کیا اسی یاد پہ پیمان وفا باندھا تھا　　عہد بھی اپنا تجھے عہد شکن یاد نہیں
پوچھتا ہے کوئی مجھ سے تو غضب یہ دیکھو　　بات کہنے کی ذرہ عرض سخن یاد نہیں
عشق میں دل بھی عجب بندۂ راحت نکلا　　کہ اسے عیش تو ہے یاد، محن یاد نہیں
پھر کرو شکوۂ بیداد یہ کیا خوب کہی　　کیا مجھے آپ کے ماتھے کی شکن یاد نہیں
دل لیا تم نے مگر عہد وفا بھول گئے　　اک سخن یاد رہا، ایک سخن یاد نہیں
اُن سے آنکھیں لڑیں بیہوش ہوا لے واعظ　　اور کچھ اسکے سوا اشغل من یاد نہیں
آسماں پردہ بنا تھا کبھی اپنا لیکن　　پیرہن تھا کہ ہمارا وہ کفن یاد نہیں

ایک وہ ہوتے تو میں یاد بھی رکھتا اے مہر
اس قدر مجکو ملے رنج و محن یاد نہیں

خاص

---

* نوٹ۔ یہ نظم دیوی سروجنی کے استقبال میں کایستھ پاٹھ شالہ میں پڑھی گئی تھی۔

شادی کا سوانگ

اٹلی بھی ایک عجیب ملک ہے۔ جس طرح سے ہندوستان دنیا کے صفحہ ہستی پر حیرت انگیز سامانوں کا خزانہ خیال کیا جاتا ہے اسی طرح سے اٹلی بھی یورپ کے ممالک میں نادر چیزوں کا سرمایہ ناز اقرار کیا جاتا ہے۔ تمام روئے زمین پر جبکہ جمہوری سلطنت وعوام الناس کی حکومت کا سلسلہ جاری ہو رہا ہے اس وقت اٹلی میں ایک مستحکم بادشاہت کی بنیاد پڑ رہی ہے۔ دنیا کے دیگر ممالک "صلح" "صلح" کے نعرہ بلند کر رہے ہیں لیکن اٹلی کے مرکز حکومت و بادشاہت یعنی سگنیر مولینی صاحب فرماتے ہیں کہ ہوائی جہاز کی ایجادوں کی زیادتی پر اٹلی کے آسمان پر زمین کے واسطے ایک شامیانہ کھڑا کر دینگے۔ مغربی ممالک تو مردم شماری کے روکنے اور اولادیں کم پیدا کرنے کی کوشش میں سرگرداں ہیں لیکن اٹلی کی گورنمنٹ میں ان سب کے متضاد ہوا بہ رہی ہے۔ اٹلی کی مردم شماری میں زیادتی ہو اولادیں جہاں تک ممکن ہو سکے عالم ارواح سے عالم فانی کے وجود میں لائی جاویں۔ حال حقیقت سے درست آگاہی ہمکو ان کے اندر ذرا دشوار ہے کہ کہاں تک اٹلی کی گورنمنٹ مردم شماری بڑھانے کی جستجو میں ہے لیکن یہ سنا گیا ہے کہ وہاں جو عورت جوڑا بچہ جنتی ہے اسکو دس پاونڈ یعنی ۱۵۰ روپیہ بطور انعام دیا جاتا ہے۔ و نیز ایک مبارکبادی کا نامہ بادشاہت کی طرف سے مرحمت کیا جاتا ہے۔ جن والدین کو خداوند کریم نے سات بچے عطا کئے ہیں انکی عزت کلبوں اور آپس کی محفلوں میں خوب کیجاتی ہے اور وہ تقدیر والے نصیب آور خیال کئے جاتے ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے جنکو اولاد کا فیض نہیں نصیب ہوا گنہگار و منحوس خیال کئے جاتے ہیں سات آٹھ بچے والی ماں کو انکم ٹیکس کم دینا پڑتا ہے اُن کے لئے ڈراموے کا کرایہ بھی کچھ سستا رکھا گیا ہے اور سینما وہ مفت دیکھ سکتی ہیں۔

اگرچہ یہ خبریں واقعی سچ ہیں تو ہمکو باریک بیں نگاہ سے یہی کہنا ہوگا کہ یورپ کسی گہرے خندق کے اندر گرنے جا رہا ہے۔ اپنی بربادی دنیا ہی کا سامان خود کر رہا ہے۔ شوہر و بی بی میں آپس کی محبت اولاد کا ہونا کوئی بازار کے خرید و فروخت کا سودا نہیں۔ اس متبرک

تعلق کا رشتہ دل اور روح سے ہوتا ہے۔ اسکا اس درجہ تک ذلیل ہو جانا علمیت پر جہالت کا سایہ پڑنا ہے۔
دنیاوی سیم وزر کے لالچ کے زور سے جو اولادین پیدا کیجائینگی ایسی اولادوں کی مستقبل زندگی و انکا معراج کسقدر تاریک و حقیر ہوگا بیان سے باہر ہے بچوں کو پیدا کرنا کسی مشین سے ایک ہزار جوڑے دھوتیوں کا بننا نہیں۔ جس ملک کا ہر مرد و عورت روز بچہ پیدا کرنے کی فکر و دھن میں مستغرق رہینگے وہ سرزمین گناہوں کے فضل سے ہری بھری و عیاشی سے معمور ہو جائیگی۔ اور چند ہی روز میں ظاہر ہو جائیگا کہ خواہشات کا زہر کس طرح رفتہ رفتہ تمام ملک کے اندرونی حصہ میں پھیلتا ہوا شرم و حجاب کی متزلزل بنیاد کو مسمار کرتا ہے۔ دوسری جانب فجسٹ گورنمنٹ کو یہ یاد رکھنا لازمی تھا کہ کسی ملک کی بہبودی تا انکے طرز گورنمنٹ میں ترقی صرف فجسیٹ ممبران کی تعداد بڑھنے پر منحصر نہیں بلکہ یہ دیکھنا چاہئے کہ جس قدر اس وقت موجود ہیں۔ ان میں کتنے راست باز و حقیقت پرست والیسی گورنمنٹ پر کامل اعتقاد رکھنے والے ہیں و کتنی تعداد میں اٹلیین انکے وصولوں کے لواحقین میں سے ہیں ہماری دلی ارزو یہی ہے کہ اٹلی کی سرزمین جوکہ تہذیب کا خزانہ و علم و فن کا مرکز رہا ہے غم اور آسیب کے ہواؤں سے محفوظ اور ہمیشہ کے لئے فارغ البالی قایم رہے۔

۱۳×۷۰

بنارس کے مشہور معروف پنڈت تری امبک شاشتری نے تخمیناً ستر سال کی عمر میں حال ہی میں ایک تیرہ سالہ لڑکی سے شادی کرلی ہے۔ اس سے پیشتر شاستری موصوف کی پانچ چھ شادیاں ہوچکی ہیں اور اُن کا ماحصل ایک لڑکا سترہ سالہ موجود بھی ہے۔ یہ خبر مشہور ہے کہ شاستری جی بخوف اپنے بیٹے کے نوعروس کو تالے میں بند کرکے مکان سے باہر قدم نکالا کرتے ہیں۔
جس قوم میں تعلیم یافتہ اور عالم، جنکا پیمانۂ حیات لبریز ہو رہا ہے، ایسی عالم ضعیفی میں اپنی نواسی کے برابر لڑکیوں سے شادی کرکے انکی زندگی کو تلخ و تباہ کرنے کے خوف سے ہراساں نہیں ہوتے اس قوم میں اگر بیواؤں کی تعداد میں ترقی ہو جائے! اس قوم کی زیست اگر بیواؤں کی آہ و بکا جگر سوز سے جلکر خاک و سیاہ ہو جائے، اس میں اگر خفیہ بدکاریاں اور قتل نوزادگاں کی کثرت ہو جائے، اس قوم کی قابل تعظیم مستورات اگر دوسرے قوموں کے شہدوں اور بد اطواروں کے تعلق ناجائز کے ذریعہ سے بھگائی جاویں تو اس میں کوئی جائے تعجب نہیں اور یہ سب عیوب محتاج بیان نہیں بلکہ ان جگر خراش واقعات کا سرزد نہ ہونا ہی تعجبات سے ہوگا۔ خوانده اصحاب اور علما کے چال و چلن کا نمونہ دیکھکر خلق اللہ تعلیم پاتی ہے۔ لیکن جس قوم کے علماء دین اور علم اخلاق کے معلمان کا اندرونی طرز معاشرت اس قدر گندہ ہو اس قوم کے معمولی درجہ کے لوگوں کی کیا حالت ہوگی اس کا قیاس کرنا روح کو ایکبارگی اپنے صدمے سے لرزاں کر دیتا ہے۔

ہند کی غلامی کا باعث یہ نہیں ہے کہ یہاں کے لوگ عالم نہیں، یہاں کی شایستگی بمقابلہ کسی دیگر ممالک کے کمتر ہے، یہاں کے لوگ فن سپہ گری میں قاصر ہیں اور یہاں کے باشندوں میں لیاقت سیاسی وحق پرستی نہیں ہے۔ ہند کی اصلی غلامی کا سبب یہ ہے کہ ہندوستانیوں کے اخلاق میں زوال آگیا ہے علماء ہند کا دماغ مخزن علوم وفنون ہے ان کی ثنا وصفت غیر ملک کے اعلیٰ ترین علما کرنے میں یک زبان ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ سوسائٹی سے ان کی بزرگی کا خیال روز افزوں مردار ہوتا جاتا ہے؟ اس کی وجہ ایسی عیاں ہے کہ چشم کور بھی اسے بلا تردد محسوس کر سکتی ہے۔ ہندوستانی علما کی کتابی واقفیت جس قدر عمیق ہے اسی قدر ان کا چال وچلن پایاب ہے۔ وے جزوی نفع کے لئے، ذاتی مفاد کے واسطے، اور اپنے سیاہ اعمال نامہ کے پردہ پوشی کے لئے کتب دینی کے معنی مطلب حسب دلخواہ لگا لیتے ہیں۔

انکو خیال روز حشر سر مو نہیں ہے۔ ایسے آزادیافتہ ہوگئے ہیں کہ بحث متضاد کا خوف مطلق نہیں۔ جس کتاب پر استدلال کر کے وے مخالفت کر سکتے ہیں اسی کلام کے رو سے موافقت بھی کر سکتے ہیں! ان علما اور توضیح کرنے والوں نے کتب مذہبی کی ایسی حالت ردی کر رکھی ہے کہ فی زمانہ لوگوں کو انکی اوپر اعتبار کرنا دشوار ہوگیا ہے۔ کبھی کبھی تو انکی ضد یا ان کا تعصب جب کہ احاطہ تمیز سے تجاوز کر جاتا ہے تو لوگوں کی نظروں میں وے باعث نفرت ہوجاتے ہیں!

بنارس کا ایک سناتنی ہندی ہفتہ وار "براہمن مہا سمیلن" اخبار جو کہ شاشتروں کے بنیاد پر اس شادی کے جوازی کا موید ہے، اس ضد وتعصب کا بدیہی ثبوت ہے۔

یہ اخبار کہتا ہے کہ شاستروں میں چیون رشی ونیز شنتنو کی شادی نہایت عالم ضعیفی میں ہوئی تھی۔ یہ ثبوت ملتا ہے۔ لہذا اگر پنڈت ترن امبیکا شاستری نے ستر سال کی عمر میں عقد کر لیا تو کونسی بیجا بات ہوگئی؟ ایک طول طویل کی تحریر اخیر میں پرانوں کے حوالہ دیتے ہوئے اخبار ہذا لکھتا ہے، "انسان کا سولہ سال تک لڑکپن اور ستر سال تک جوانی اور اسکے بعد معمولاً عالم ضعیفی کہا جاتا ہے" اس ثبوت کے بموجب یہ امر ثابت شدہ ہے کہ شاستروں میں جو عالم ضعیفی کی شادی ممنوع ہے، اس عالم کا شمار بعد از ستر سال کیا جانا متصور ہے، تب اس دلیل کے بموجب ستر سال کے بعد ہی نفس پرستی کا مخالفت عالم پیری کا زمانہ شروع ہوتا ہے۔ اس دلیل کے بموجب ثابت ہے کہ شاستروں میں عالم پیری کی شادی کی جو ممانعت کی گئی ہے یہاں پیری کے لفظ سے ستر سال کے بعد ہی کا زمانہ شمار کرنا اچھا ہے، کیونکہ کاتیاین کے کلام بالا سے بھی نہایت ضعیف کی شادی ممنوع سمجھی جاتی ہے تیرا ہمتر مہا سمیلن" ایسے ہٹی اور بیجا اخبار کو

یہ کون سمجھاوے کہ شادی کی نگاہ سے ۶۰ اور ستر سال کی عمروں میں کوئی زیادہ فرق نہیں ہوتا؟ پھر پنڈت تری امبک شاستری چیون رشی اور شنتنو کی طرح قوتور ہونے کا دعویٰ بھی نہیں کر سکتے! پرانوں میں تو برہما کا اپنی بیٹی سرسوتی پر فریفتہ ہونیکا قصہ بھی پایا جاتا ہے تو کیا تراہمتر مہاسم میلن اپنی بیٹی سے شادی کر لینے کو بھی شاشتر کی منشا بتلائیگا! مشہور کاشی کے اس بے تمیز اخبار کو ہم یہ بھی بتلا دینا چاہتے ہیں کہ شنتنو اور چیون رشی اپنے خاص بیٹے سے اپنی بیوی کی حفاظت کی فکر بھی نہیں کرتے تھے! اُس زمانہ میں ستر سال کی عمر کا مرد آج کل کے ۳۰-۳۵ سال کی عمر کے مرد کی طرح ادھیڑ سمجھا جاتا تھا، اور اُسے اپنے قوت میں شک وشبہ نہیں ہوتا تھا۔

کاشی کے ایک مشہور پنڈت کے ذریعہ سے اس قابل نفرین عالم پیری کی شادی کی جانے کی وجہ سے اس کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے۔ بدقسمتی سے ہندوستان کے غیر تعلیم یافتہ لوگ ابھی تک ان راندہ پنڈتوں کے چنگل میں پھنسے ہوئے ہیں۔ اخباروں اور عام جلسوں کے ذریعہ سے اگر اس شادی کی سخت مذمت نہیں کیجائیگی تو قوم کے اخلاقی زندگی پر اس شادی کا بہت ہی قابل اثر پڑنیکا احتمال ہے۔ ہمیں نہایت خوشی ہے کہ اہالیان کاشی نے ایک جلسہ عام کرکے سب کے اتفاق رائے سے اس مضموم شادی کے ناجائز کا فتویٰ دیا ہے۔ گذشتہ ۱۱ر اگست کو کاشی کے ٹاون ہال میں بصدارت پنڈت کرشن چندر ملا ایک بہت بڑا جلسہ ہوا تھا جس میں اس قابل نفرین شادی کے مخالفت میں کئی پنڈت علما کی تقریریں ہوئیں اور آخر میں سب کے اتفاق رائے سے یہ رائے قایم کی گئی کہ کاشی کے رہنے والے ہندوؤں کا یہ جلسہ کاشی کے ایک مشہور وید سے نے اولاد کے رہتے ہوئے ۷۰ سال کی عمر میں، سناتن دھرم کے اصولوں کے خلاف ۱۳ر سال کی لڑکی سے جو شادی کی ہے، اُس سے از حد مخالفت کرتا ہے اور جملہ ہندو بھائیوں سے مستدعی ہے کہ آیندہ اس قسم کی شادی کے روکنے کے لئے پہلے ہی سے مستعد رہیں۔ ملک بھر میں جلسہ عام منعقد کرکے اس قابل نفرین شادی کی مذمت و نیز عوام میں پیری کی شادی کے رواج کے خلاف اعلان کرنا چاہئے۔

جہالت

ترقی کے معنی بہتر حالت کے ہیں جس میں موجودہ حالت کو بہتر بنانے سے مخالفت کی خو ہوتی ہے وہ ترقی ہرگز نہیں کر سکتا۔ مسلمانان ہند معاشرتی اور مذہبی معاملات میں تبدیل پسند نہ ہونے کے باعث رفتار زمانہ سے موافقت نہیں کر سکتے اور اس وجہ سے ان قوموں اور فرقوں کے ساتھ جو کہ اپنے دیرینہ طرز معاشرت اور طریق تربیت و تعلیم میں حسب رفتار زمانہ اصلاح کرنے کے لئے مستعد کمربستہ ہیں اپنے موازنہ میں ہم پلہ نہیں ہو سکتے۔ وہ اپنی اس خامی کے طرف نظر نہیں کرتے

کہ کس قدر پچھڑ گئے ہیں اور اپنے تحفظ مرتبت کے لئے گورنمنٹ سے مختلف صورتوں میں امداد وسہارے کے خواستگار ہوتے ہیں۔ نہایت افسوس کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے کہ مسٹر غزنوی نے کانفرنس اسلامیہ میں سارداایکٹ کی نسبت جو یہ فرمایا کہ یہ ظلم، دل آزاری کفر و بدعت کا مصدر ہے اور یہ بیان کہ بمقابلہ اس کے وائسرائے کا اناؤنس منٹ ہیچ و پوچ ہے اس بات کا بدیہی ثبوت ہے "کہ تعلیم یافتہ مسلم لیڈران میں کس قدر تبدیل حالت سے مخالفت کی خوبو باقی ہے۔ تعلیم و تربیت کا مقصد یہ ہے کہ انسان بہایم کی طرح میراث آبائی سے ایک انچ بھی ترقی نہ کرکے ازل سے ابد تک جیوں کا تیوں ہی نہ بنا رہے بلکہ انسان سے فرشتہ بننے کی سعی کرے اور ترقی کناں رہے۔ عموماً ہر انسان کی یہی خدا داد صفت ہے اور خصوصاً تعلیم یافتہ اشخاص تو دنیا میں قابل نمونہ سمجھے جاتے ہیں اور انھیں کی تقلید عوام کرتے ہیں اگر ان میں یہ شوماِ لغ ترقی بھبوکسہ سو باقی رہ گئی تو پھر تعلیم بے سود ہے۔

اگر مسلمان ہند اس مفید تدبیر سے مستفید ہونا نہیں چاہتے اور اگر ان کی بہ فرض محال یہ خواہش پر بھی آوے تو نقصان کسکا ہوگا انھیں اہل اسلام کا۔ اگر وہ لوگ۔ بہ حیلہ شرعی رفتار زمانہ کے ہم قدم ہونا نہیں چاہتے تو بلا شک حصول مقصد مرام کے تگ و دو میں منزلوں پیچھے رہ جاوینگے یہ مسلمانوں کی درد ناک ہوتے کا جگر سوز نالہ بالکل بے اثر ہوجائے گا کیونکہ کثیر تعداد اہل اسلام کی ترقی و اصلاح کی دلدادہ ہے اور روز افزوں اس جانب رواں دواں ہے، اس جماعت کو اس امر کا واثق یقین ہوتا جارہا ہے کہ اسلامی تسلیم حسب رفتار زمانہ ہمیشہ ترقی کناں اور پابند دلایل عقلی و نقلی رہی اور اسکا یہ مقولہ رہا کہ

درخت اگر متحرک شدے زجائے بجائے
نہ جور آرہ کشیدے و نے جفائے تبر

مسلمانوں میں واقعی ایسے عالی خیال لوگ واقع ہیں خضر راہ اسلام ہیں نہ کہ مسٹر غزنوی جو کہ بلاوجہ معقول ترقی قوم میں سدراہ ہیں اس تحریر سے میری غرض یہ ہے کہ ہمارے مسلم بھائی اپنی آنکھوں اور اپنی قوت بازو اور اپنے قدموں کا سہارا اور بھروسہ کریں یہ سب خدا کی دین ہے ورنہ کفران نعمت سے دین و دنیا میں کہیں ٹھکانا نہیں لگتا۔ اس کلام میں بہت زور ہے صرف نظر عمیق درکار ہے۔

زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز،

عقل و تمیز کا تقاضہ تو یہی ہے کہ انسان خود اپنے عیوب پر نگاہ رکھے اور اگر یہ ایں مقصدان کہ

آپ اپنے عیب سے واقف نہیں ہوتا کوئی
جیسے بو اپنے دہن کی آتی ہے کم ناک میں

تو دوسروں کے دکھلانے پر آنکھ کھول کے چلنا واجب ہے۔ ورنہ نابنا د چاہ درپیش کی

جو حالت ہوتی ہے اُس سے نجات نہیں ہو سکتی

دوست آنست کو معائب دوست
ہمچو آئینہ روبرو گوید
نہ کہ چوں شانہ باہزار زبان
پس سر رفتہ موبمو گوید

انسانوں پر حیوانیت کا غلبہ

یہ ایک ایسا بے مثل واقعہ ہے کہ جسپر ہرکہ ومہ کی نظر غور و فکر غوطہ زن ہو کرکے حقیقت کی تہ تک نہیں پہنچ سکتی یعنی بیٹا اپنی ماں کو درد و پریشانی سے نجات دینے کی غرض سے مستحق اُسکی ہلاکت کا ہے فرانس میں جوڈیشل نے بھی یہ فتویٰ دیا ہے اور یہی فیصلہ اس مقدمہ کا کیا ہے۔

جب سے فیصلہ شائع ہوا ہے اس پر خوب چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں اور اسکے جواز و عدم جوازی پر بحث جاری ہیں اور بہت سے مشہور و معروف بزرگوں نے اپنی اپنی رائے کا اظہار کردیا ہے بلا استثنا سب نے اس فیصلہ سے مخالفت کی ہے اور بہ اتفاق کہا ہے کہ دنیا میں کبھی کوئی ایسی صورت نہیں ہو سکتی کہ انسان کسی کے ہلاکت کا مستحق ہو سکے۔ اور یہ تحریک کہ انگلستان میں ایک جلسہ ڈاکٹروں کا اس غرض سے منعقد ہو کہ از روئے علم طب کسی مریض کو ایسی حالت میں جبکہ اُسکی پریشانی قابل برداشت نہ ہو ہلاکت کرکے اُسکی صعوبت کا خاتمہ کردینا واجب و جائز ہے یا ہو سکتا ہے لوگوں نے بیک قلم نامنظور کردیا ہے۔

سر جان بلینڈ سوٹن بڑے مشہور و معروف سرجن نے اس مسئلہ کے متعلق بہت کچھ سرزنش کی اور بسا اوقات ڈاکٹروں کے مجمع میں اس سوال پر بحث و مباحثہ بھی کیا ہے۔ اُن سے ملاقات کی گئی اور انھوں نے بزور اسکی تردید کی ہے۔ وے فرماتے ہیں" اس فیصلہ پر بہت کچھ غور و فکر کیا گیا لیکن اس سے انگلستان میں کسی نے اتفاق نہیں کیا۔ میں بذات خود تو ایسے جلسہ میں ہرگز شرکت نہ کرونگا۔ یہ تو جلادی کا کام ہے جس کے خیال ہی سے وحشت ہوتی ہے شاید سب سے بڑی دلیل ایسی ہلاکت کی ناجائز ہونے کے متعلق یہ ہے کہ کیسا ہی ہوشیار ڈاکٹر کیوں نہ ہو اور اسکو مریض کے مرض مہلک کا یقین کامل بھی ہوجانے پر بھی وہ ایسا قبل از مرگ قتل کرنے کی اجازت نہ دیگا۔ یہاں تک کہ مریض کی خواہش موت کے اظہار سے بھی حق ہلاکت جائز نہیں ہو سکتا۔ بسا اوقات مجھ سے مریضوں نے اپنی تکلیف کے خاتمہ کردینے کی درخواست نہایت ہی درد انگیز طریق پر کی کہ جناب ڈاکٹر صاحب قدرے مارفیہ کی مقدار اور بڑھا دیجئے میں موت سے ہم آغوش ہونے کے لئے بیتاب ہوں! لیکن بہت سے ایسے مریض میرے نظر سے گذرے ہیں کہ جو درد و پریشانی موت کے ساعی و داعی تھے اسباب کا شکریہ کرتے پائے گئے آپ نے میری استدعاء موت رد کرکے مجھ پر بڑا احسان کیا۔ محض اتنا ہی ذاتی تجربہ اس ہلاکت کے جواز کی تردید کے لئے کافی و شافی ہے۔ یہ یقین واثق ہے

کہ کوئی شخص بھی اس خیال کی موافقت یہاں نہ کریگا فرانس میں جو چاہے وہ رائے قایم کرلیجاوے اور فیصلہ کر دیا جاوے" جبکہ انگلستان میں جہاں کہ بوڑھے گھوڑے کو گولی مار دینا ہمدردی سمجھی جاتی ہے وہاں بھی اس فیصلہ سے موافقت کے لئے کوئی دستیاب نہیں ہوتا تو ہندوستان میں جو کہ اہنسا کا دلدادہ ہے۔ کوئی شخص ایسے خیال کے سُننے کو بھی گوارہ نہیں کرسکتا

حق بین کی حق بات

یتافت ستارہ بلندی بہ بالائے سرش ز ہوشمندی

زہے طالع زہے نصیب کہ جس نے چائلڈ میرج بل کو قانون بنوا کے اصحاب ملک وقوم بلکہ بنی آدم کی وہ خدمت کی ہے کہ جسکا ثمر نیک اسکی آل واولاد کے آگے آویگا۔ یہ وہ بزرگ شخصیت ہے کہ جو ایسا نیک کام کرکے تنے چند اصلاح کناں ملک وقوم کی دعائیں اور زیادہ تر جہلا۔ گمراہوں اور دشمنان ترقی وبہبود کی بددعائیں سنتے ہوئے بھی پہاڑ کی طرح اپنی جگہ سے نہیں ٹلی آج وہی انڈین نیشنل کانفرنس کے بیالیسویں جلسہ میں جو بمقام لاہور ۲۶ ر دسمبر ۱۹۲۹ء کو منعقد ہوا تھا صدر نشین جلسہ بنا اگرچہ صدر ہر جا کہ نشیند صدر ست۔ تاہم صدر کا یہ انتخاب نہایت انسب اور موزوں تھا۔ جناب موصوف نے جو تقریر پریسیڈنشل چیئر سے کی ہے قابل یادگار ہے۔ کیونکہ سوشل ریفارمس کی بہت سے مدات پر اسقدر کثرت سے بحث ومباحثہ اور تقریریں ہوچکی ہیں کہ ان سے اب بجز سامعین کی سمع خراشی کے اور کچھ حاصل نہیں ہوتا مگر کسی امر کی بابت بارہا تکرار اور مکرر سہ کرر اصرار ہی ہل چل مچانے کی جان ہے اور اسی سلسلہ جنبانی سے مدتوں کے سوئے ہوئے خیالات بیدار ہوا کرتے ہیں۔ تاہم بار بار کسی امر کا بیان فعل عبث وناگوار سا ہو جاتا ہے مگر ہمارے حق بین وحق شناس جناب ہربلاس شاردا صاحب نے انھیں پرانی باتوں کو اور گائی گیتوں کو یعنی ذات پانت کی پابندی کا توڑنا، چھوت اچھوت کے بے بنیاد خیال کا دور دفع کرنا، بیوگان کی دوسری شادی، مستورات کی ترقی اور ان کا وقار ان کی تعلیم کی کوشش اس لب ولہجہ سے بیان فرماکہ باید وشاید۔ آپ کا طرز بیان ایسا لاجواب تھا کہ سننے والے محو ہوگئے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا ان مضامین پر کبھی کوئی ایسی تقریر سنی ہی نہیں۔ وجہ پوچھئے کہ کیوں؟ تو صرف یہ کہ ایسے سچے دلی خیر اندیش اور تہ دل سے تقریر کرنے والے کے منہ سے اب تک نہیں سنا تھا۔ جو لوگ ان مضامین پر تقریر کرنے والے تھے وہ مضمون کی بندش اور الفاظ کی سجاوٹ وغیرہ کے دل دادہ تھے نہ کہ نفس مطلب کے اسی وجہ سے ان کی بات پابند اثر نہیں ہوسکی۔ تقریر میں زیادہ زور اس بات پر بھی دیا گیا تھا کہ سوشل ریفارم بحالت موجودہ ضابطہ قانونی کے ذریعہ سے ہونا چاہئے یہ بات تجربہ سے بخوبی ثابت ہے کہ محض عوام کی

کثرت رائے سے خاطر خواہ تبدیلیاں کرنے میں کافی موثر نہیں ہوتی مثلاً کم عمری کی شادی کے انسداد کے مسئلہ سے یہ بات ثابت ہے یعنی اس رواج کے خلاف ہزاروں بار تقریریں ہوئیں اور ہر جلسہ میں کثرت سے عوام کی رائے موافق رہی تاہم یہ بدرواج ویسا ہی عموماً دامن گیر رہا اور ہے خصوصاً ان قوموں اور فرقوں میں جہاں کہ اسکا بکثرت رواج ہے وہاں پرانے کٹر لوگوں کا زور بہت زیادہ ہے۔ علاوہ بریں اس ملک میں لوگ اس خیال خام کے بہت قائل ہیں کہ کہنے اور کرنے میں بہت بڑا فرق ہے۔ ایسے کتنے لوگ ملیں گے جو کہ بلا خیال ذات پانت یا خود یا شادی کرنے خواہ بیوہ عورتوں کی شادی کرنے کے لئے مستعد و آمادہ ہیں۔ اس خیال سے اتفاق رائے کا اظہار محض نمائشی اور زبانی دعویٰ ہے ورنہ واقعی اس پر عمل کرنے کو ایک شخص بھی تیار نہیں ہے۔

سارروا صاحب نے فرمایا کہ اس زمانہ میں عوام کی ترقی کے لئے قانون سے بڑھ کر کوئی دوسرا چارہ کار نہیں ہے۔ وہ خطرناک رواج جو تکلیف دہ ہیں، جو باعث جور و ستم ہیں، جو قومی قوت کو کم کرنے والے ہیں اور ترقی میں مانع ہیں، قانون ہی کے ذریعہ سے رفع کئے جا سکتے ہیں۔ عورتوں کی حالت فی زمانہ مرکز غور و فکر ہو رہی ہے۔ واقعی سارروا صاحب کی بہت ہی مناسب بات تھی کہ اپنی تقریر کا ایک جزو اعظم اسی مسئلہ کے لئے مخصوص کر رکھا تھا کہ جب تک عورتیں تعلیم یافتہ نہیں ہوتیں، ان کے ساتھ اعزاز و اخلاق کا برتاؤ نہیں کیا جاتا اور ان کے حقوق مال و ملکیت جائداد کے بمقابلہ مردوں کے قبول اور منظور نہیں کئے جاتے قوم کی ترقی ناممکن ہے کیونکہ عورتوں کا سوشل اور خانگی معاملات میں اتنا سخت دباؤ پڑتا ہے جو کہ سوشل ریفارم کا جانی دشمن ہے۔

عورتوں کی جہالت، انکا آنکھ بند کر کے بلا سوچے سمجھے پرانے رسم و رواج میں اعتقاد اور ان بدرواجوں کی اہمیت پر سر منڈنا سوشل ریفارم میں سد راہ ہیں اور اسکو آجکل کے تعلیم یافتہ ہندوستانی اس زمانہ کے لئے جس میں کہ انھیں رہنا سہنا ہے بالکل نا موزوں سمجھتے ہیں۔ پس سوشل ریفارم کا کام مستورات میں قابلیت اور قبولیت پیدا کر کے انکی اخلاقی اور مالی حالت کو ترقی سے زیادہ وابستہ ہے۔ وہ لوگ جو ملک کو آزاد بنانا چاہتے ہیں ان کو لازم ہے کہ پہلے عورتوں کی مالی، دماغی اور سوشل قیود کو توڑیں اسی سلسلہ میں ان کے حق وراثت کو قانوناً قایم کرا دینا نہایت ضروری ہے انصاف اور قانون دونوں اسبات کے متقاضی ہیں کہ اب میراث کی موجودہ صورت میں رد و بدل ہونا لازمی ہے۔ اس مضمون پر بحث کرتے ہوئے صدر نشین صاحب نے نہایت قابلیت کے ساتھ اس بات پر زور دیا کہ اگر لڑکا اپنے باپ کے ترکہ میں حقدار ہے تو کس اخلاقی یا روحانی بنا پر لڑکی کو اسکے حق و حصہ سے محروم رکھا جاتا ہے۔ قدرتاً بیٹی اور بیٹے کے حقوق مساوی ہیں۔ لڑکی کا بذریعہ رسم شادی ایک خاندان سے دوسرے میں ہمیشہ کیلئے چلا جانا ایک ایسی بات ہے کہ جسکی وجہ

سے بقدر مناسب لڑکی کے حق حصہ میں بمقابلہ بیٹے کے کم وبیش کردیجئے نہ اسکو بالکل محروم کردیجئے مزید براں وہ اپنے شوہر کے جائداد میں بھی ایک حصہ پانے کی مستحق ہے بذریعہ شادی وہ اپنے شوہر کی خاندان کی ایک دوامی ممبر بنجاتی ہے لہذا وہ اس خاندانی جائداد میں جسکی کہ وہ دوامی ممبر بنجاتی ہے حقدار ہو جاتی ہے۔

جناب سارد ا صاحب نے لجسلیٹو کونسل میں ایک بل پیش کردیا ہے کہ ہندو بیوہ خاندانی جایداد میں اپنے شوہر کے حصہ میں اپنی اولاد کے ساتھ (اگر ہو تو) ترکہ پانے کی حقدار قانونی بنا دیجاوے۔ اپنے خاندان میں بلکہ تمام جہان میں عورت کو مساوی درجہ دلانے کے لئے یہ امر ضروری ہے کہ ترکہ میں اس کا حق قانوناً قایم کرا دیا جاوے۔ اور جسوقت جائداد خاندانی میں قانوناً حقدار بن گئی اسکی بہت سی مصیبتیں دور ہو جائینگی خدا وہ بھی دن بہت جلد نصیب کرے کہ جناب صدر نشین صاحب کی یہ رائے اور تحریک بھی ضابطہ قانون بنجاوے اور ہندوستان کے ماتھے سے کلنک کا ٹیکہ چھڑا دے۔

جان پہچان

ہمارے ملک میں یوں تو اسوقت بہت سے کام کرنے والی لائق اور نامور ہستیاں موجود ہیں۔ جن کے مختصر حالات پبلک کو معلوم ہیں یا معلوم ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن سیکڑوں نہیں ہزاروں اسی قسم کی ہستیاں بھی ہیں جو کام نہایت اعلیٰ کرچکی ہیں یا کررہی ہیں مگر زیادہ تر اپنی ایشیائی خاک ساری اور عدم شہرت پسندی سے اور خال خال اور وجوہ سے اپنے نام اور کام کی ناموری نہیں چاہتے حالانکہ ایسے اشخاص کے حالات زندگی اور کارنامے ملک کی اُٹھتے والی پود کے واسطے سبق انگیز ہوسکتے ہیں اور دوسروں کو ویسے ہی طریقہ پر کام کرنے کی رہنمائی کرسکتے ہیں اسلئے ہم یہ چاہتے ہیں کہ "چاند" میں ایک خاص باب اس قسم کے اصحاب کی سوانح عمریوں کا کھولیں اور بقدر گنجائش ایک یا دو "جیونیاں" ہر رسالہ میں شایع کرتے رہیں۔

ان سوانح کو خود وہی اصحاب اپنے قلم سے لکھیں اور نہایت سچائی کے ساتھ مختصراً اپنے کارناموں کو بتائیں تو بہت اچھا ہے۔ ورنہ ہمکو مفصل حالات لکھ بھیجیں تاکہ ہم ان کو ترتیب اور اصلاح کے بعد جتنا مناسب سمجھیں شایع کردیں اور تصاویر کی اشاعت کا بھی اہتمام کیا جائیگا۔

چاند کی تاریخ اشاعت

منیجر "چاند" کی گذارش بخدمت ناظرین :- باوجودیکہ ہندی "چاند" کی اشاعت پندرہ ہزار ہے تاہم وہ ہر ماہ کی یکم کو شایع ہو جاتا ہے۔ اسلئے "چاند" کے دونوں ایڈیشنوں کی اشاعت یکم کو فی الحال مشکل ہے۔ علاوہ اسکے اُردو کے پہلے ہی پرچہ کی مانگ اسقدر زیادہ ہوگئی ہے کہ ماہ گذشتہ کی تعداد سے ایک ہزار زاید کاپیوں کے چھپانے کا اہتمام کرنا لازمی ہوگیا ہے چنانچہ اُردو "چاند" ہر مہینے کی پندرہ تاریخ کو شایع ہوا کریگا۔

گلۂ دوستاں

'چاند' کے جنم کا پہلا ہی دن معاصرین کے لئے روزِ عید ہوگیا، اکثر ہمعصروں نے اس کی روشنی سے اقتباس کیا اور اپنے تئیں چمکالیا لیکن 'چاند' کے حوالہ سے گریز کر گئے، ہمیں اس سے خوشی ہوئی اور گلہ بھی ہے، مسرت اس کی کہ 'چاند' کی چاندنی سے بہتیروں نے اپنے گھر روشن کرلئے اور گلہ اس کا ہے کہ قانون و اخلاق کی قیود کو توڑ کر 'چاند' کا نام چھپانا چاہا مگر 'چاند' پر کب خاک پڑسکتی ہے' اس قسم کے دوستوں سے مخلصانہ گزارش ہے کہ آئندہ اس اخلاقی گلہ کو ملحوظ رکھیں اور ہمیں پھر ایسا موقع نہ دیں حوالہ دیدینا عالی ظرفی کی دلیل اور قدردانی کی سبیل ہے، ورنہ یہاں کیا ہے۔

"صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے"

بسنت مبارک

مہرجہاں تاب کی کرنیں کچھ سیدھی پڑنے لگیں، سردی کی سرد مہریاں دُور ہوکر گلابی جاڑوں کی ابتدا ہوگئی، جاڑے کی شدت سے جما ہوا خون پگھلنے اور رگوں میں دوڑنے لگا، سرسوں پھولکر کشتِ زعفران کو شرمانے لگی، ہندوستان کے بینظیر ثمر انبہ نے شگوفہ نکالا، دہقان کی کشتِ اُمید ہری ہوئی، ربیع کی فصل تیار ہونے کے آثار نمایاں ہو چلے نہ پالے سے پالا پڑا نہ اولوں سے ستھراؤ ہوا، کسان کی لو کھیتی سے لگی ہے، گیہوں، جو کے خوشوں کو دیکھکر نہال ہوجاتا ہے، خانۂ قلب خوشی سے مالامال ہوجاتا ہے، کیوں نہ ہو گاڑھی محنت ٹھکانے لگی ہے سردی کا چلہ اُتر گیا، گرمی کی کمان چڑھ رہی ہے، گرم لباس جسم سے اُتر گئے، ٹھنڈے ہلکے پھلکے کپڑے زیبِ تن ہوئے، موسمی زرد پھولوں کا رنگ دیکھکر لوگوں نے بسنتی جوڑا پہنا، گنگا جی کے اشنان کو جاتے ہیں، ایشور کی بھگتی میں مگن ہیں پوتر جل میں نہا دھوکر پاپ سے شدھ ہونگے، یا جاڑوں کی جمی ہوئی کثافت دُور کرکے بستہ مسامات کھولیں گے، جسم کی اندرونی خرابیاں ابخرات اور پسینہ بنکر نکلینگی، تندرستی کا سامان ہوگا، خوش ہر انسان ہوگا۔

اس روزِ مسرت کی آمد پر ہم بھی ناظرین 'چاند' کو مبارکباد پیش کرتے ہیں اور ان کی صحت و خوش وقتی کے طالب رہکر نظرِ کرم کے متمنی ہیں۔

انڈپنڈنس اور 'چاند'

کانگریس کے چوالیسویں سالانہ اجلاس میں بڑی بلند آہنگی سے کامل خودمختاری کی تجویز پیش ہوئی، اور اتفاق آراء یا بہت بڑی کثرت رائے سے منظور بھی ہوگئی، آزادی فی الحقیقت ایک محبوب ترین چیز اور ہر انسان کی غایت آرزو ہے لیکن ہمکو اپنے قابل اور نوجوان پریسیڈنٹ صاحب سے اس وقت

سخت اختلاف ہے کہ وہ تمام سیڑھیوں کو ایکدم سے پھلانگ گئے اور دفعتہً وہاں جا پہنچے جہاں قوم و ملک کی ابھی پہنچ ہونا تو کجا اس کا خیال تک بھی نہیں چلسکتا ہندوستان میں باہمی اختلافات اور اجتماعی امراض وبا کی طرح پھیلے ہوئے ہیں، قوم اب تک قوم نہیں بنی ہے، ہر فرقہ اپنا اپنا راگ الگ الاپتا ہے، عقائد کے اختلاف کو الگ رکھئے فرقہ بندیوں اور چھوت اچھوت کی مہلک وباہی کا انسداد ابھی نہیں کیا گیا ہے، کانگریس صرف پالٹیکس کو لیکر دوڑ رہی ہے اور مجلسی اصلاحوں اور قوم کو صحیح معنوں میں قوم بنانے سے دور بھاگتی ہے، حالانکہ یہ مانی ہوئی بات ہے کہ کوئی شکستہ حال اور ٹوٹی پھوٹی قوم اس زمانہ میں ترقی کے راستہ پر قدم نہیں مار سکتی اور ہندوستان پر پھوٹ کی نیند ایسی مسلط ہے کہ وہ کسی طرح اُس کے سر سے نہیں اُترتی، ہماری رائے میں انڈین نیشنل کانگریس کا اوّلین فرض ملک و قوم کی اندرونی اصلاح کے ساتھ اس کے اندر قوت و توانائی پیدا کرنا ہے جسکے بعد سیاسی حقوق خود بخود حاصل ہو سکتے یا کئے جا سکتے ہیں۔

صاحب صدر کے پریسیڈنشل ایڈریس پر مفصل رائے زنی ہم آئندہ نمبر میں کرینگے فی الحال ان کی اونچی اور لمبی پھلانگ سے اپنا سخت اختلاف ظاہر کر دیتے ہیں اور اسکی تفصیل مارچ کے پرچہ میں دینگے، تاکہ ناظرین ہمارے اختلاف کے بجا یا بیجا ہونے کا خود فیصلہ کر سکیں۔

کلامِ عارف

[حضرت عارف الہ آبادی]

کسی نے حسن کا جلوہ مجھے دکھا بھی دیا — مثال طُور دلِ زار کو مٹا بھی دیا

بتوں کے ظلم و ستم نے ہمیں جگا بھی دیا — دل و دماغ میں نقشِ خدا جما بھی دیا

قیام عیش و مصیبت کا ہے حباب آسا — کبھی فلک نے ہنسایا کبھی رُلا بھی دیا

بتاؤ مسجد و مندر میں ڈھونڈھنے والو — کہ جس کو ڈھونڈھتے ہو اُس نے کچھ پتا بھی دیا

کرم ہے عشق کا دل پر کہ جس نے درد کے ساتھ — ہمارے پہلو کو جامِ جہاں نما بھی دیا

فنا کے بعد بھی ذرّوں سے اُٹھیں گے شعلے — کسی نے سوزِ غمِ محسن گرہ دبا بھی دیا

ابھی یہ بات ہے کل کی کہ ہم تھے جانِ چمن — اور آج اہلِ چمن نے ہمیں بھلا بھی دیا

ترے کلام میں عارف عجب اثر دیکھا
رُلا دیا کبھی احباب کو ہنسا بھی دیا

خاص

قواعد و ضوابط

(۱) "چاند" ہر انگریزی مہینے کی پندرھویں تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔

(۲) سالانہ چندہ آٹھ روپئے، ششماہی پانچ روپئے بمد پیشگی۔ نمونہ کا پرچہ ۸؍ کے ٹکٹ آنے پر ارسال خدمت ہوگا کوئی صاحب نمونہ مفت طلب کرنے کی تکلیف نہ کریں۔

(۳) خریدار اصحاب خط لکھتے وقت چٹ نمبر ضرور لکھا کریں۔ ورنہ جواب کی شکایت معاف۔

(۴) "چاند" میں اعلیٰ پایہ کے علمی۔ ادبی۔ اخلاقی۔ طبی۔ تاریخی۔ تحقیقی مضامین (نثر و نظم) شائع ہوتے ہیں۔

(۵) جو مضامین درج نہ ہونگے انکے واپس کرنے کا ایڈیٹر "چاند" کو پورا اختیار ہوگا۔ مگر ٹکٹ آنے پر واپس کر دئے جائیں گے۔

(۶) ایڈیٹر کو مضامین کی ترمیم و تنسیخ کا پورا مجاز ہوگا۔

(۷) مضامین کے متعلق جملہ خط و کتابت منشی کنھیالال ایڈیٹر "چاند" (اردو) کے نام ہونی چاہئے اور دیگر امور و ترسیل زر منیجر کے نام ہونی چاہئے۔

(۸) مشتہرین اشتہارات بھیجکر فائدہ اُٹھائیں۔ اُجرت ذیل میں درج ہے اس میں کسی قسم کی کمی نہیں ہوسکتی۔

نرخنامہ اشتہارات

پیمانہ صفحہ	ایک بار
پورا صفحہ یا دو کالم۔	بیس روپئے
نصف صفحہ یا ایک کالم۔	بارہ روپئے آٹھ آنے
چوتھائی صفحہ یا آدھا کالم۔	سات روپئے، آٹھ آنے

نرخنامہ اشتہارات سرورق (مستقل پورے سال کیلئے)

صفحہ ۲ و ۳ ۵۰ روپیہ ماہوار
صفحہ ۴ [illegible] روپیہ ماہوار
} اُجرت ہر حال میں پیشگی آنی چاہئے۔

منیجر رسالہ "چاند" الہ آباد

لذیذ کھانے

(اُردو ایڈیشن تیار ہو رہا ہے)

آٹھ سو چھتیس اقسام کے لذیذ کھانوں کا بنانا سکھلانے والی بے بہا کتاب۔ دال۔ چاول۔ روٹی۔ پلاؤ۔ میٹھے اور نمکین چاول قسم قسم کی سبزیاں سب قسم کی مٹھائیاں، پکوان، سیکڑوں طرح کی چٹنی۔ اچار، رائتے اور مربے وغیرہ بنانے کی ترکیب بہت تشریح کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔

اس کتاب میں مختلف قسم کے غلّے اور مسالوں کے برے بھلے گن بتلانے کے علاوہ کھانے کے متعلق شاید ہی کوئی ایسی چیز چھوٹ گئی ہو کہ جس کا مشرح ذکر اس ضخیم کتاب میں نہ کیا گیا ہو۔ ہر ایک چیز کے بنانے کی ترکیب اتنی مشرح اور سلیس زبان میں دی گئی ہے کہ تھوڑی بھی پڑھی لکھی لڑکیاں اس سے پوری طور سے نفع اُٹھا سکتی ہیں۔ چاہے جو چیز بنانا ہو کتاب سامنے رکھ کر آسانی سے بنا سکتے ہیں۔ ہر ایک طرح کے مسالوں کی مقدار پوری طرح سے لکھ دی گئی ہے۔ ہندی زبان میں اس کتاب کی آٹھ ہزار جلدیں جنکی قیمت بحساب چار روپیہ فی جلد تھی بک چکی ہیں۔

اپنا نام خریداروں کی فہرست میں درج کرائیے

"چاند" (اُردو) آفس، الہ آباد

گھریلو دوائیاں

مرتبہ بہت سے مشہور ڈاکٹر وید اور حکیم

چاند کی ہر ایک جلد میں بڑے بڑے نامی ڈاکٹروں، ویدوں، اور تجربہ کاروں کے ہاتھ سے لکھے بے بہا نسخے شائع ہوتے ہیں۔ جس سے بہت سے لوگوں کو بہت کچھ نفع ہوا ہے اور سبھوں نے ان نسخوں کی صداقت و مختلف طرح پر ان کا استعمال کرکے نفع اُٹھاکر بالاتفاق تعریف کی ہے۔ ان کے ذریعہ سے علاج ڈاکٹری میں سیکڑوں روپیہ کے خرچ کی بچت ہوسکتی ہے۔ اس نہایت کارآمد کتاب کی ایک جلد ہر گھر میں ہر ایک خانہ دار کو رکھنا چاہیئے۔

چھپائی صاف اور کاغذ موٹا ہے ۔ اور اُردو ایڈیشن قریب قریب تیار ہے۔ اپنا نام خریداروں کی فہرست میں فوراً درج کرائیے ورنہ دوسرے ایڈیشن کا انتظار کرنا ہوگا۔

منیجر "چاند" (اُردو)

الہ آباد

پرنٹر بجرنگ بہادر سریواستو بجرنگ پریس ۳۹ ہیوٹ روڈ الہ آباد

Regd. No. A—1990

ADARSH CHITTRAWALI

OR

AN IDEAL PICTURE ALBUM

A printing-specimen of the Chand-printery

The Fine Art Printing Cottage

TWENTY-EIGHT EDMONSTONE ROAD

ALLAHABAD

RESPONSIBLE OPINIONS

The Hon'ble Mr. Justice Sir B. J. Dalal of the Allahabad High Court:

Your Album ADARSH CHITTRAWALI is a production of great taste and beauty and has come to me as a pleasant surprise as to what a press in Allahabad can turn out. Moon-worshipping and Visit to the temple are particularly charming pictures—life like and full of details. I congratulate you on your remarkable enterprise.

Sam Higginbottom, Esq., Principal Allahabad Agricultural Institute:

. . . I think it is beautifully done. Most of the guests who came into the Drawing room pick it up and look at it with interest.

The Hon'ble Sir Grimwood Mears, Chief Justice Allahabad High Court:

. . . I am very glad to see that it is so well spoken of in the Foreign Press.

Lt.-Col. H. R. Nutt, I. M. S., Civil Surgeon Allahabad:

. . . The color execution is exceedingly good.

S. H. Thompson, Esq., I. C. S., Collector, Allahabad:

. . . I consider for the most part highly artistic. Some of the pictures, which are not quite at a par with the majority, might be omitted, but otherwise the Album is a very praiseworthy production.

W. E. J. Dobbs, Esq., I. C. S., Distt., Magistrate, Allahabad:

I am glad that Allahabad can turn out such a pleasing specimen of the printers art.

A. H. Mackenzie, Esq., Director of Public Instruction, U. P.:

. . . I congratulate your press on the get-up of the Album, which reveals a high standard of fine Art Printing.

G. P. Srivastava, Esq., B. A., LL. B.:

. . . Really it is a unique publication of its kind. The pictures are excellent and choicest; at the same time the printing is simply marvelous. It must have its success.

The Indian Daily Mail:

. . . The album ADARSH CHITTRAWALI is probably the one of its kind in Hindi—the chief features of which are excellent production, very beautiful letter-press in many colours, and the appropriate piece of peom which accompanies each picture . . .

The Hon'ble Mr. Justice Lal Gopal Mukerjea of the Allahabad High Court:

. . . The Pictures are indeed very good and indicate, not only the high art of the painters, but also the consumate skill employed in printing them in several colours. I am sure the Album ADARSH CHITTRAWALI will be very much appreciated by the public.

Price Rs. 4/- Nett Postage Extra

THE MANAGER

The CHAND Office

CHANDRALOK—ALLAHABAD

Only Litho Printing done at the Barrang Press and the rest printed and published by R. SAIGAL at the Fine Art Printing Cottage 28 Edmonstone Road, Chandralok, Allahabad.